

”خضریٰ! کیا بات ہے بٹی۔ کل رات سے دیکھ رہی ہوں، بہت پریشان دکھائی دے رہی ہو۔“

”کوئی بات نہیں ہے انا بی! آفس میں آج کل کام بہت بڑھ گیا ہے اور.....“ اُس نے دانستہ کوئی بات ہونٹوں سے باہر نکلنے سے روکی تھی۔

”اور کیا؟ کیا چھپانے کی کوشش کر رہی ہو؟ کیا بات ہے؟“ انا بی چائے کا ٹنگ ٹیبل پر رکھ کر اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر متفکر لہجے میں گویا ہوئیں۔

”میرے ساتھ یہی تو مسئلہ ہے کہ آپ سے کوئی پرابلم چھپانا بھی چاہوں تو نہیں چھپا سکتی۔“

”اپنوں سے پریشانیاں چھپانا، ان کی محبتوں اور خلوص پر بے اعتمادی ظاہر کرتا ہے بٹی۔ اور پھر میرا تمہارے سوا اور تمہارا میرے علاوہ کون ہے سوائے اللہ کی ذات کے۔ اگر ہم ایک دوسرے کو اپنی پریشانیوں اور مسرتوں سے باخبر نہیں رکھیں گے تو گھٹ گھٹ کر مر جائیں گے۔“

”کل بڑے سرفارن ٹور پر لمبے عرصے کے لئے چلے گئے ہیں اور ان کے پیچھے آفس کا سارا سسٹم ان کے اکلوتے بیٹے شانزل خان کے کنٹرول میں آ گیا ہے۔ آج سے تمام آفسز وہی کنٹرول کرے گا۔“ از حد تنگرو پریشانی خضریٰ کے چہرے اور لہجے سے عیاں تھی۔

”بہت سخت مزاج کا ہے کیا وہ لڑکا؟“

”سخت مزاج نہیں بلکہ بہت رنگین مزاج کا مالک ہے۔ از حد بد فطرت اور عیاش۔“

”تمہیں اس کے مزاج سے کیا لگتا بیٹی، جو تمہارا کام ہے اس پر ہی دھیان دینا۔“

”شانزل گروپ آف انڈسٹریز میں مجھے کام کرتے ہوئے عرصہ ہی کتنا ہوا ہے۔ بڑے سرفہرے کام سے کام رکھنے والے بندے تھے۔ ثانیہ بتا رہی تھی پچھلے سال بھی شانزل خان بڑے سر کے بزنس ٹور پر جانے کے بعد آفس آنے لگا تھا اور اس نے اپنے ذوق کی تسکین کے لئے آفس کے تمام پورٹرنٹس میں رنگینیاں پھیلا دی تھیں۔ اور بھی بہت کچھ اس کے بارے میں ثانیہ نے بتایا ہے۔ میرا توکل سے برا حال ہے، یہی سوچ کر کہ میں کس طرح فیس کروں گی اس شخص کو۔ یہ جاب کتنی پریشانیوں کے بعد ملی ہے پھر یہاں تنخواہ بھی خاصی مناسب ہے۔ اگر کہیں اور اچھی جاب ملنے کا ذرا بھی چانس ہوتا یا ہمیں جاب کی اتنی سخت ضرورت نہیں ہوتی تو میں کل ہی چھوڑ کر آ جاتی۔“

”اچھے اور برے لوگ ہر جگہ ہوتے ہیں۔ یہ کوئی انہونی بات نہیں ہے، تم اس قدر گھبرا کیوں رہی ہو؟ جن لڑکیوں کو مجبوریاں گھر سے باہر قدم نکالنے پر مجبور کرتی ہیں وہاں اتنا حوصلہ و جرأت بھی ہشتی ہیں کہ وہ آگے آنے والی ہر مصیبت و پریشانی کا مقابلہ کر سکیں۔ یقین رکھو عورت اگر موسم سے زیادہ نرم ہے تو فولاد سے زیادہ سخت بھی ہے۔ مرد لاکھ ضدی، جھٹ دھرم، طاقتور اور عیاش سب، مگر اپنی عزت و ناموس کی حفاظت کرنے والی اور فولادی عزم رکھنے والی عورت کا مقابلہ ہرگز نہیں کر سکتا۔ مرد جب عورت کی طرف بڑھتا ہے تو عورت کی رضامندی ہوتی ہے۔ ورنہ کسی مرد کو اتنی جرأت نہیں ہو سکتی کہ وہ عورت پر ایک نگاہ ڈالنے کے بعد دوسری ڈال سکے۔ اپنے اندر اعتماد پیدا کرو۔“

انابی کی باتوں نے خاصی ہمت و جرأت پیدا کر دی تھی۔ وہ یہ فیصلہ کر کے مطمئن ہو گئی کہ وہ خود کو اس قدر نمایاں کرے گی کہ اس کی نگاہوں کا مرکز بنے اور نہ ہی اس قدر سنجیدگی سے کام کرے گی جو وہ بلاوجہ اس کی طرف متوجہ ہو۔

فیصلہ کرنے کے بعد تمام ٹینشن اور کنفیوژن سے آزاد ہو کر وہ بالکل ریٹیکس ہو کر کام کر رہی تھی۔ ثانیہ حسب عادت گھر لو پریشانیاں ڈسکس کر رہی تھی۔ وہ کیپوٹر مانیٹر پر نکلیں، جمائے کی بورڈ پر انگلیاں چلاتے ہوئے اس کی باتوں کا جواب دے رہی تھی۔

”سازھے گیارہ بج چکے ہیں۔ سرائیکی ٹیک نہیں آئے۔ اس ٹائم تک ہمارا آدھا کام ٹسٹ چکا ہوتا ہے۔“ اس نے کیپوٹر آف کرتے ہوئے حیرانی سے کہا۔

اسی دم گیٹ کھلا اور براؤن پیٹ کوٹ میں ملیوں وہ دروازہ قامت شخص دکھش مسکراہٹ کی روشنیاں بکھیرتا ہوا اندر داخل ہوا تو تمام اسٹاف باس کے احترام میں اسٹینڈ اپ ہو گیا۔ وہ بھی ثانیہ کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ اسے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہی وہ ”شاہکار“ ہے جس کا انتظار تھا۔ سب کے سلام کا جواب دیتا ہوا وہ اپنے روم کی طرف بڑھ گیا تھا۔

”ایسے ہی موقع پر کہا جاتا ہے کہ نام لیا اور شیطان حاضر۔“ ثانیہ مسکرا کر یولی۔

ثانیہ کے ریمارکس کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کی بورڈ پر اس کی انگلیاں تیزی سے چل رہی تھیں اور ذہن میں سوچوں کے انبار تھے۔ بظاہر تو اس شخص میں ایسا کوئی تاثر نظر نہیں آیا تھا جس سے اس کی بدکرداری کی کوئی رمت ملتی۔ بلکہ بڑے سر کی نسبت وہ کچھ بہتر ہی لگتا تھا جو بہت خوشدلی سے سب کے سلام کا جواب مع مسکراہٹ کے دے کر گیا تھا۔

”خضریٰ بی بی، کسی کے بارے میں رائے قائم کرنے میں اتنی جلد بازی سے کام نہیں لیا کرو۔ کل ثانیہ سے اس کے بارے میں سن کر وہ اتنی خوفزدہ ہو گئی تھی کہ ساری رات اور صبح خوف و پریشانی میں گزاری تھی۔ اور اب ایک نگاہ میں اس کی ظاہری شرافت و شانگی سے نظریں متاثر ہو گئیں۔“ اس نے اپنے آپ کو سرزنش کی اور مکمل توجہ مانیٹر پر مرکوز کر دی۔

”آگئیں بیٹی! کیا لگا باس؟“ انابی جو گیٹ کے قریب ٹہل رہی تھیں، اس کے سلام کا جواب دے کر یہ سرداری سے گویا ہوئیں۔

”میں اسی لئے آپ کو بتانا نہیں چاہ رہی تھی کہ میری خیر موجودگی میں آپ کا سارا وقت فکر مند ہوتے اور ذخائیں مانگتے گزرا ہوگا۔“ اس نے مسکراتے ہوئے ان کے گلے میں بانٹیں ڈالتے ہوئے کہا۔

”باس دیکھنے میں تو ویسا ہی ہے جیسے کروڑ پتی گھرانوں کے اگھوتے لڑکے ہوتے ہیں۔ افکار و انتشار سے پاک زندگی، بہترین غذا اور زندگی کی تمام آسائشوں کی دستیابی جنہیں حسن، خوبصورتی اور حد درجہ اعتماد و طمانیت اور آسودگی بخشی ہے۔ وہ بھی ایسا ہی ہے۔ لیکن بظاہر ملنسار اور شریف لگ رہا ہے۔ مگر عموماً ایسا ہوتا ہے کہ لوگ جس طرح نظر آتے ہیں، ویسے ہوتے نہیں۔“

”اللہ کا شکر ہے، میری دعا مستجاب ہوئی اور آئندہ بھی اللہ کرم کرے گا۔ چلو آؤ میں نے آج چائے کے ساتھ پکڑے بنائے ہیں اور ساتھ ٹائڈ کی چٹنی بھی بنائی ہے۔“ وہ خاصی مطمئن سی اُس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے آئیں۔ خضریٰ کپڑے چھینچ کرنے روم کی طرف بڑھ گئی۔ کچھ دیر بعد وہ کمرے میں صوفے کے پاس رکھی ٹیبل پر پکڑے کھانے میں مصروف تھی۔

”اپنے اوپر اعتماد رکھو۔ اگر آپ اچھے ہیں تو دوسرے کی برائی آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔“

”انانی! آج کے وقت میں یہ فلسفہ کامیابی کی سند نہیں پاسکتا۔ اس دور میں ہم جن سے بچ کر چلنا چاہتے ہیں، وہی ہماری راہ کی بھاری رکاوٹ ثابت ہوتے ہیں۔“

”ہمت نہیں ہارتے بیٹی۔“ انانی نے بھاپ اڑاتا ہوا چائے کا گگ اس کے آگے رکھتے ہوئے سمجھانے کی کوشش کی۔

”کرائے دار نے کرایا دیا؟ فیاض آنے ہی والا ہوگا۔“

”کئی بار تقاضا کر چکی ہوں۔ انہوں نے کل کا کہا ہے۔ دراصل بنی آج کل کے حالات تو دیکھ ہی رہی ہو، پہلے پڑوسی ملک پر امریکی حملے کے باعث ہماری معیشت پر کتنا اثر پڑا اور ابھی اس بحران سے نکلے بھی نہ تھے کہ دشمن ملک کے جنگی جنون نے اور زیادہ کاروبار پر برے اثرات ڈالے ہیں۔ ہر جگہ ایک خوفناک و اضطراب کی کیفیت ہے۔ ایسے میں وہ مجبور لوگ کہاں سے روزی کمائیں جو صبح سے شام تک کما کر لاتے ہیں تو گھر کا چولہا جلتا ہے۔ اور ہمارے ملک میں تو کثیر تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو روز

کنواں کھودتے ہیں اور پانی پیستے ہیں۔ آئے دن بیروزگاری سے جگ آ کر خودکشی کرنے والوں کی خبروں سے اخبارات بھرے ہوتے ہیں، ایسا ہی ہوتا آیا ہے ہر دور میں۔ غریب، غریب تر ہوتا جا رہا ہے اور امیر، امیر ترین۔“

”نہ معلوم کب ہمارے ملک میں خوشحالی آئے گی اور کرپٹ اور بے ضمیر لوگوں سے عوام کی جان چھوٹے گی۔ ہو شر یا مہنگائی نے ہم جیسے لوگوں سے زندگی کا حسن چھین لیا ہے۔ ہر آنے والا دن فکر اور پریشانیوں کا سورج طلوع کرتا ہوا ابھرتا ہے۔“ اُس نے گگ ہونٹوں سے لگاتے ہوئے دگر فٹ لہجے میں کہا۔ اتانی اُس کے گردش معاش میں جکڑے چہرے کو دیکھ کر طویل سی رہ گئی تھیں۔

”رات کو کیا کپے گا؟“ وہ ان کو افسردہ دیکھ کر تیزی سے موڈ بدل کر گویا ہوئی۔

”کل کا سالن، چنے کی دال گوشت خاصا بچا ہوا تھا۔ میں نے اس میں دو آلو بال کر ڈال کر چیس لیا۔ ٹھیک ٹھاک شامی کباب کا مصالحہ تیار ہو گیا ہے، ہر مصالحہ ڈال کر کباب تیار کر کے رکھ دیئے ہیں۔ کھاتے وقت فرانی کر لیں گے، تب ہی تھوڑی سی سلاڈ اور راسخہ بنا لوں گی اور شامی کبابوں کے ساتھ پراسے اچھے لگتے ہیں، وہ بنا لوں گی۔“

”واہ! اس کو کہتے ہیں ٹوان ون۔ کل دال گوشت آج وہ بن گئے شامی کباب اور کل میں بناؤں گی، دن ان تھری، یعنی کل دال گوشت، آج شامی کباب پھر اٹھے اور کل آفس کے لئے میں اس کے سینڈوچ بنا لوں گی۔“ اُس نے ہنستے ہوئے کہا تو اتانی بھی مسکراتے لگیں۔

”آپ نے مجھے بلایا سر؟“ اُس نے دھڑکتے دل کے ساتھ اندر قدم رکھتے ہوئے استفسار کیا۔

”ہیں، پلیز سٹ ڈاؤن۔“ شانزل خان نے آگے رکھی فائل سائیڈ میں کھسکاتے ہوئے سامنے رکھی چیئر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”جھینکس سر۔“

پانچ منٹ گزر چکے تھے اور وہ بالکل خاموش تھا۔ خضریٰ کو کنفیوژن ہونے لگی تھی۔ آخر اس کی خاموشی بلاوجہ توجہ نہ ہوگی۔ اس کی گہری نگاہوں کا حصار وہ اپنے چہرے پر محسوس کر رہی تھی۔

ایک ہفتہ ہوا تھا اسے آفس جوائن کئے ہوئے اور اس ایک ہفتے میں تمام اسٹاف میں یہ واحد لڑکی ایسی تھی جو اسے نظر انداز کر رہی تھی۔ اس کا رویہ اتنا محتاط و خشک ہوتا تھا کہ اس جیسے سر پھرے اور مشکل پسند بندے کی نگاہوں میں آگئی تھی۔

”آپ نے مجھے کیوں بلایا تھا سر؟“ بالآخر دس منٹ گزر جانے کے بعد اسے پوچھنا پڑا۔

”آپ مجھ سے اس قدر خوفزدہ کیوں ہیں؟“ بہت اطمینان سے ٹھہر ٹھہر کر لفظ ادا کئے گئے۔

”مم..... میں آپ سے خوفزدہ کیوں ہوگی سر۔“ اس کی صاف گوئی اسے لمحے بھر کو یوگلا گئی تھی۔ وہ شاید انسانی رویوں کا بہت گہرائی سے تجزیہ کرنے کا ماہر تھا۔

”یہی تو میں آپ سے معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کا رویہ میرے ساتھ ایسا کیوں ہے؟ مجھے دیکھ کر آپ کے چہرے پر ایسے تاثرات ابھرتے ہیں جیسے کسی گھٹیا ترین غنڈے، بد معاش کو دیکھ کر انسان خود کو اس سے بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور یہاں آفس میں بھی آپ فائنلر چیک کروا کر اس طرح بھاگتی ہیں جیسے مجھے کوئی خطرناک بیماری ہو جس کے جراثیم آپ کو لگ جانے کا خطرہ ہو۔ میں آپ کو آگاہ کر رہا ہوں کہ نہ مجھے کوئی بیماری ہے اور نہ ہی میرا فیملی بیک گراؤنڈ کسی بد معاش سے وابستہ ہے۔“ اس نے خاصے خشک لہجے میں لفظ چبا چبا کر ادا کئے تھے۔

”آپ کو غلط فہمی ہے سر۔ میں بھلا کیوں یہ سب سوچوں گی۔ میں ایک بے حد معمولی سی ورکر ہوں، آپ کو میرے محسوسات کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔“

”میں آپ کو بریف کر دیتا ہوں کہ میرا اور ڈیڑے کے کام کرنے کا اسٹائل قطعی مختلف ہے۔ میں اسسٹنٹ سے واضح مین تک کی پروا کرتا ہوں۔ میری نگاہ میں محنت سے کام

کرنے والے ورکرز سب قابل احترام و اہم ہیں، کوئی معمولی نہیں۔“ اس کا نرم لہجہ شائستہ اور مہذبانہ تھا مگر آنکھوں سے نکلتی تپش اسے سر جھکانے پر مجبور کر رہی تھی۔

”یہ فائل ہے آپ کی، اس میں تمام کوائف درج ہیں۔ بہت حیرت ہو رہی ہے مجھے یہ جان کر کہ آپ میری ہیں۔ اس کے باوجود اس قدر محتاط و گریز پارو یہ حیران کن ہے۔ اب تو پچھلے گرلز بھی خاصی انڈیپنڈنٹ اینڈ ماڈ ہو گئی ہیں۔“ نامعلوم کب تک اس کا فضول ٹاپک چلا کہ اس کی گرل فرینڈ کے آجانے کے باعث اس کی خلاصی ہوئی۔

”ہائے ڈیڑے! بڑی ہو؟“ لیو پیٹ، بلیک سیلوئس شرٹ میں لمبوس ڈارک میک اپ میں اس کا حسن دمک رہا تھا۔ بڑے والہانہ انداز میں وہ شانزل خان کے شانے سے لگی ہوئی پوچھ رہی تھی۔ ہاس نے خضریٰ کو جانے کا اشارہ کیا اور فق چہرہ لئے وہ لمحے بھر میں وہاں سے اپنے کیمین میں لوٹ آئی۔

”ارے..... کیا ہوا؟“ ثانیہ نے حیرت سے اسے بدحواس سادیکھ کر حیرانی سے کہا۔ ”لا حول و لا قوۃ، جو سین کبھی فلموں میں دیکھے تھے، اب وہ حقیقت میں دیکھنے کو ملیں گے۔“ اس نے ثانیہ کو تمام باتیں گول کر کے شانزل خان اور اس کی فرینڈ کے ملنے کا انداز بتایا تو وہ بے اختیار ہنس کر بولی۔

”میری جان! یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ ہمارے سر تو بہت اوپن مائینڈڈ ہیں۔ وہ اپنی گرل فرینڈ سے کوئی فاصلہ رکھ کر ملنے کے عادی نہیں ہیں۔ کچھلی مرتبہ جب آئے تھے تو یہاں ریسپشن پر شرمیلا سنگھ ایک غیر مسلم لڑکی تھی، ابجو کیڈ تو زیادہ سنہ تھی مگر حسین بلا کی تھی۔ سرنے پہلے دن اسے دیکھا اور دوسرے دن وہ ڈائریکٹ ان کی پرسنل سیکرٹری کی سیٹ پر تھی اور پھر وہ تھے اور سیکرٹری صاحبہ۔ گھنٹوں وہ ان کے ساتھ آفس میں گزارتی تھی اور کسی کو آؤ رنڈ تھا کہ پریشن کے بغیر وہاں چلا جائے۔ شرمیلا کے ساتھ سر کا فائر چھ سات ہفتے چلا، وہ شروع شروع میں بہت عام سے لمبوسات میں آتی تھی مگر سر کی رفاقت نے تو اس کی تقدیر ہی بدل ڈالی۔ وہ راتوں رات فرش سے عرش پر جا پہنچی۔ اس نے کارلی، مہنگے علاقے میں کوٹھی خریدی اور بہت ٹھاٹ سے رہنے لگی تھی۔ سر کے ساتھ

کئی ہفتے وہ شمالی علاقوں میں بھی گزرا کر آئی۔ پھر سر کی نگاہ انتخاب بڑے آفس کے سیکرٹری کی اسٹینٹ پر پڑی۔ روحیلہ مسعود سے دوستی کا آغاز ہوا تو شرملا سنگھ کو ذرا پکڑ دیا گیا۔ لیکن اس مدت میں شرملا نے اتنا چٹک بیٹھیں بنا لیا کہ نہ صرف کار، کوشی کی مالک بن بیٹھی بلکہ اس نے ایک پوش علاقے میں بہت جدید انداز میں بیوٹی پارلر کے ساتھ سلفیج سینٹر کھول لیا۔ اب وہ یہاں سے ریڑاؤں کر کے پارلر اور سینٹر چلا رہی ہے۔ روحیلہ مسعود سے بھی سر کی دوستی اسی طرح ہر حد کو پار کرتی ہوئی چند ہفتے قائم رہی اور اس نے بھی دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ لی اور سر کی توجہ اگلے شکار کی طرف مرکوز ہوتے ہی وہ ملک سے باہر جا کر سیٹل ہو گئی۔ سر کے شکاروں کی لسٹ بہت طویل ہے اور اس میں حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وہ کسی بھی لڑکی کو زبردستی حاصل نہیں کرتے۔ لڑکیاں ہینڈ سم، فٹنگ پر سنائی اور پھر دولت پر دل و جان سے مروتی ہیں اور سر چند ہفتوں سے زیادہ کسی کو برداشت نہیں کرتے۔ لیکن لڑکیاں بہت گھیل عرصے میں دولت اور جتنے ترین تھے سمیٹ کر شاندار مستقبل بنا لیتی ہیں۔ "ٹانیہ نے چائپ رائٹر کی جانب متوجہ ہونے سے قبل تمام ہاتھ گویا اس کے گوش گزار کر دی تھیں۔

"تمہاری معلومات میں اور اضافہ کروں، یہ جو مجترمہ ابھی آفس میں آئی ہیں، یہ غیر ملکی چائپ کی ماڈل ہے، بلکہ گزشتہ سال کی مس یونیورس بھی ہے اور سنا ہے سر کی دوستی اس سے کچھ زیادہ ہی "گہری" ہے۔" ٹانیہ دوبارہ اس کی جانب متوجہ ہوئی تھی۔ ٹانیہ کا بہترین مشغلہ تھا یہ۔ اسے دوسروں کے متعلق باتیں کرنے کا جنون تھا۔

"بائی گاڈ، چھوڑو اس قصبے کو۔ ہمیں صرف اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے۔ فضول میں کیوں دوسروں کے بارے میں تجسس رہیں۔" اس نے سنجیدگی سے موضوع بدلنا چاہا۔

"تم میں نہ معلوم کون سی بوڑھی اور دنیا سے بیزار روح سمائی ہوئی ہے میری جان! سمجھو بے کی طرح اپنے خول میں بند رہتا چھوڑو، آپ دنیا سے کنارہ کشی اختیار نہیں کر سکتیں۔ بے ضرر اور بے وقوف لوگ اس دور میں ٹھوکریں کھاتے ہیں، کبھی منزل پر نہیں

پہنچتے۔ اپنے اندر چھینچ لاؤ، ارد گرد سے باخبر رہا کرو اور کچھ میگزینز وغیرہ بھی پڑھ لیا کرو۔ سر جھکا کر آنا اور سر جھکا کر جانا ترک کر دو بلکہ سراسر اٹھا کر چلا کرو۔"

"اؤکے مائی لارڈ۔ اگر آپ کے احکامات نمائشوروں کی فہرست ختم ہو گئی ہو تو میں اپنا کام شروع کروں؟" خفتری مسکرا کر بولی تو ٹانیہ ہنس پڑی۔

"اب سکون سے کام کریں گے۔ دیکھو سر اب کیوتری کے ساتھ اڑ رہے ہیں اور بھی ان بڑے لوگوں کے بھی بڑے ہی مزے ہیں۔" ٹانیہ نے شیشے کے پار کو پڑھنے سے لفت روم کی طرف جاتے ہوئے شانزل خان اور ماڈل جیٹر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

گھر میں قدم رکھتے ہی سارے دن کی تھکن مزید بڑھ گئی جب اس نے بڑے اطمینان سے رافع فیاض کو انابی کے تخت پر دراز پایا۔

"اوہ! آج تم، جیسی کھوں یہ روشنی کیوں ہر جگہ پھیل گئی ہے، فضا میں خوشبو کی بکھر گئی ہیں۔ ماحول۔۔۔"

"پلیز اسٹاپ اٹ۔ مجھے نہیں سنی یہ تمہاری فضول بکواس۔ انابی! یہ آدمی یہاں کیوں ہے؟ آپ نے اس کا حساب کیوں نہیں کیا؟" ترش لہجے میں رافع سے مخاطب ہو کر وہ انابی سے بولی۔ وہ کچن سے برآمد ہوئی تھیں۔ دونوں ہاتھ آٹے میں بٹے ہوئے تھے۔

"بیٹی، کرائے دار کا کام نہیں ہے۔ دو ہفتے ہو گئے اس کی ملازمت ختم ہوئے۔ وہ خود بیوی بچوں کے ساتھ فاتے کر رہا ہے۔ اسے ہیٹ بھرنے کو نہیں ہے، بے چارے کرایہ کہاں سے دیں۔"

"واہ، کنگلوں سے کنگے ہی نکراتے ہیں، کیا کریں بھی۔۔۔"

"سٹ اپ، بہتر یہی ہوگا، یہاں سے تم دفع ہو جاؤ۔ تم جیسے ذلیل آدمی کی مکروہ شکل دیکھتے ہوئے بھی ٹھن آتی ہے۔" وہ اس کی بات قطع کر کے نفرت انگیز لہجے میں غرائی تھی۔

”اب کیا کریں؟ مگر وہ ہوں یا ممنوع، آدمی تمہارا ہی تو ہوں۔ تم نہ مانو یہ الگ۔۔۔“

”ارے میاں! کیوں پریشان کرتے ہو۔ بچی پہلے ہی تمہی باری آفس سے آئی ہے، اوپر سے تم بیک بیک کرو رہے ہو۔ جب کہہ دیا پیسے کچھ دن بعد آ کر لے جانا تو پھر جاؤ۔“

انابی خضر کی مشتعل کیفیت دیکھ کر جلدی سے بولیں۔

”میں پچھلے ماہ سے یہ کچھ دن کی گردان سن رہا ہوں، اب مجھ سے مزید برداشت نہیں ہوتا۔ مجھے سیدھی طرح سے میرا روپیہ چاہئے یا پھر اپنی لاڈلی سے کہیں چل کر میرے ساتھ رہے۔ سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔ اسے شہزادی بنا کر رکھوں گا۔ صبح شام بسوں کے دھکے کھا کھا کر جو اس کا روپ رنگ خراب ہو گیا ہے، ایک دم گلاب کے پھول کی مانند کھل جائے گا۔ یہ ایک دفعہ راضی تو ہو جائے میرے ساتھ رہنے کے لئے۔“ رافع فیاض نے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے خضر کی طرف پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”مگر چکے بکواس؟ تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ خاموشی سے یہاں سے نکل جاؤ۔ ورنہ میں ابھی رخسانہ کو فون کر کے بتا کر آتی ہوں کہ تم مجھے ساتھ لے جانے کے لئے تیار ہو۔“

”ایک دفعے کے اندر اندر مجھے میری رقم مل جانی چاہئے۔ ورنہ پھر مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔“

رخسانہ کی دھمکی آج بھی کارگر ثابت ہوئی اور وہ دھمکیاں دیتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

”منہ ہاتھ دھو لو بیٹی، میں اتنے میں گرم گرم پھلکے پکا کر لاتی ہوں۔ اسٹو بنایا ہے آج میں نے۔“

”نہیں، اب کھانا نہیں کھایا جائے گا مجھ سے۔ صرف ایک کپ چائے دے دیں۔“

باتھ روم کی طرف جاتے ہوئے اس نے حسب توقع خاصے پڑ مردہ لچہ میں کہا تھا۔ اور جب تک وہ باتھ روم سے حلیہ درست کر کے کمرے میں آئی، تب تک انابی بکن سے فارغ ہو کر اس کے لئے بھاپ اڑاتا چائے کا گگ بھیل پر رکھے بیٹھی تھیں۔

”بہت تھکی تھکی لگ رہی ہو۔ بہت کام تھا آج؟“

”کب سے آیا ہوا تھا وہ؟“

”ایک گھنٹہ ہوا تھا اسے آئے ہوئے۔“

”نہ معلوم کیوں ہم جیسے لوگوں کی مشکلات گزرتے وقت کے ساتھ دراز ہوتی جاتی ہیں۔ حراماں نصیبی دنگ دنگ کے منگوں سائے شاید موت کی آغوش میں پہنچا کر ہی ساتھ چھوڑیں گے۔“ اس نے گگ سے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے افسردگی سے کہا۔

”نا اُمیدی مسلمانوں کا شیوہ نہیں ہوتی بیٹی۔ رب کسی کو دے کر آزماتا ہے اور کسی کو ترسا کر۔ مگر بندے کی برداشت سے زیادہ نہیں آزماتا۔ ہر رات کا سویرا ضرور ہوتا ہے۔ ڈکھوں کے بعد خوشیاں بھی رب کی طرف سے دامن بھردیتی ہیں۔ مایوسی گناہ ہے۔ ڈکھوں سے گھبراتے نہیں، ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ انشاء اللہ بہت جلد اس کی رحمت کی بارش ہم پر بھی برے گی۔“ اس کی افسردگی انابی کو ہمیشہ ہی لولوں و افسردہ کر دیتی تھی اور خاص طور پر وہ رافع فیاض کے آنے کے بعد تو بہتوں پریشان رہتی تھیں۔ آج بھی وہ آیا تو انہوں نے لاکھ کوشش کی کہ وہ اس کے آنے سے پہلے چلا جائے مگر وہ بھی اپنے وقت کا ایک ڈھیٹ و بے حس آدمی تھا، جب تک خضر کی کوجلا کر اس سے باتیں نہ سن لیتا، وہ جاتا ہی نہ تھا۔ اب انہیں معلوم تھا وہ ہمتوں پریشان رہے گی اور اس دوران کھانا پینا تو برائے نام ہی رہ جائے گا۔ اس کی فکر انہیں اپنی صحت سے زیادہ رہتی تھی۔

”انابی! رافع فیاض کے آنے سے قبل زندگی اتنی دشوار تو نہیں تھی، اس شخص کے سامنے نے میری زندگی دھکی ہوئی دوزخ بنا ڈالی ہے۔ اس کی لالچی و حرص فطرت کو جانتی ہیں آپ، ایک ماہ اس نے نہ معلوم کس طرح صبر کیا ہے، اب ایک ہفتہ صبر کرنے والا نہیں ہے۔ وہ باہر گئی میں آ کر گدھے کی طرح چیخے گا اور لوگ نہ معلوم کیا سوچیں گے ہمارے بارے میں۔ ایک عزت ہی تو ہم نے بنائی ہے زندگی میں۔ اگر وہ بھی چلی گئی تو سانسیں بند ہو جائیں گی۔ اور میں اس خبیث شخص کی قرض دار نہیں مرنے چاہتی۔“

”اللہ بڑا بادشاہ ہے، اس پر معاملہ چھوڑ دو، وہ خود حل کر دے گا۔“

”بے شک، اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے ہمارا۔ کرائے دار کی مکاریاں آپ سمجھ نہیں رہی ہیں۔ ابھی ایک ہفتہ قبل کلرٹی وی لایا ہے۔ کیا وہ ڈاکہ مار کر لایا ہے؟ جب اس کا کوئی کام نہیں ہے تو، اور صبح شام آپ کو اس کے بچن سے نت نئے کھانوں کی خوشبوئیں نہیں آتیں؟ کرایہ ادا کرنے کے لئے وہ قاتل مر رہا ہے۔ اتالی لوگوں نے آج کل بھی ڈھونگ رچا رکھا ہے، سب کچھ ہوتے ہوئے بھی روتے رہتے ہیں، ہمارے پاس کچھ نہیں ہے، اپنی غرض پر منوں میں لاکھوں روپیہ اڑا دیتے ہیں۔ ان سے میں خود بات کروں گی۔“

”نہیں نہیں، تمہیں کسی کے منہ نکلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود بات کروں گی۔ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ بچے ضد کر رہے تھے تو بھائی کاٹی وی کچھ دنوں کے لئے لایا ہوں۔ اچھا کل اس کا چھوٹا والا بیٹا تمہیں یہی بتا رہا ہو گا۔ تو یہ تو بے کیسے بے ایمان لوگ ہیں۔ ایسے لوگ سچے مصیبت زدہ لوگوں کا یقین بھی گنوا دیتے ہیں۔ بس تم بے فکر ہو جاؤ، اب میں خود چند دن نظر رکھوں گی، پھر خود نٹ لوں گی۔“

اس نے اتالی سے نظر ہچا کر وہ سونے کے جڑاؤ نکلنے نکال لئے جو امی نے بہت محبت سے اس کے لئے بنوائے تھے، سلائی اور گھریلو ضروریات کم سے کم کر کے۔ انہیں معلوم تھا ان کی بیٹی کو عام لڑکیوں کی طرح بھاری جیولری پسند نہیں ہے، وہ صرف نازک سے ایئر رنگ اور ہاتھوں میں سونے کی چوڑیاں پہننے کی خواہش بھیجنے سے ہی کرتی آتی تھی۔ انہوں نے روپیہ روپیہ جوڑ کر چار چوڑیاں اور دو جڑاؤ نکلنے اس کی شادی کے لئے بنوائے تھے۔ چار چوڑیاں رافع فیاض کو وہ دے چکی تھی اور ان نکلنے کو اس نے بہت محبت و احتیاط سے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ ان سے اسے ماں کی محبت اور خوشبو نکلتی محسوس ہوتی تھی۔ از حد چاہنے والی ماں کو اس کے صدمے نے ہی تو دوسرے جہان پہنچا دیا تھا۔ ماں کی مشتوں سے بنائی گئی نشانی اسے دل و جان سے عزیز تر تھی۔ نکلنے کے چمکتے محسوس میں ماں کی مست، مجبوری والا چارگی سب نظر آتا تھا۔ جب بھی ماں کی زیادہ یاد

آتی، وہ ان نکلنے کو نکال کر چومتی، انہیں سینے سے لگا کر تھنوں بے خود ہو جاتی۔ اسے گلن ماں کی آغوش نے اسے ڈھانپ لیا ہے اور وہ پُر سکون ہو جاتی۔ اور اب مجبوری میں وہ انہیں فروخت کر کے رافع فیاض کی رقم دینے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ یہ واحد چیز تھی اس کے پاس فروخت کے لئے۔

وہ نکلنے پرس میں ڈال کر آفس چلی آئی تھی۔ خاموشی اور عجیب گم محسوس کیفیت کا شکار ہو گئی تھی۔ نکلنے سے دلی و جذباتی طور پر وابستگی نے اسے مضطرب کر ڈالا تھا۔ شکر تھا کہ آج تانپہ کسی وجہ سے آفس نہیں آئی تھی ورنہ وہ ضرور اس کی کیفیت نوٹ کر کے خوب سوالات کرتی اور مطمئن کرنے کے لئے نہ معلوم اسے کون کون سے بہانے بتاتے پڑتے کہ اپنی خود داری وانا اسے جان سے بڑھ کر عزیز تھے۔

”ایکسی کیڑی ایجنی پر اہلم؟“ شانزل خان کی آواز بہت قریب سے گونجی تھی۔
”سس..... سر! آپ یہاں؟ مجھے بلا لیا ہوتا۔“ اسے اپنے بہت قریب کھڑا دیکھ کر وہ ہلکا کر کھڑی ہو گئی۔

”میں دو مرتبہ یہاں سے گزرا ہوں اور ہر بار آپ کو پریشان اور اُداس دیکھا ہے بلکہ رنجیدہ اور افسردہ، ارد گرد سے قطعی بیگانہ جیسے آپ کو کسی کی جدائی کا صدمہ ہو یا آپ جبراً کسی سے الگ ہو رہی ہوں۔“ وہ اپنے مخصوص دھیمے اور مسکراتے لہجے میں بول رہا تھا۔

خضرئی اس کی قیافہ شناسی پر دنگ رہ گئی تھی۔ وہ بلا کا ذہین اور حساس طبیعت کا مالک تھا۔ از حد خامیوں کے علاوہ چند خوبیاں بھی اس کی ذات میں موجود تھیں لیکن وہ اس کی بے باک آزاد فطرت کے نظارے دیکھ چکی تھی، اس لئے اس پر کسی قسم کا اعتبار کرنا اس کے لئے ناممکن تھا۔ اس کا یوں کہیں میں پانا کہ اسے آنا بھی اسے ناگوار گزرتا تھا۔

”ایسی کوئی بات نہیں سر! آپ بتائیں، کیا کام ہے؟“
”میں نے آپ سے کہا تھا کہ میرے اور ڈیڈ کے کام کرنے کا انداز بالکل جدا ہے۔ مجھے عام ورکر سے واقع میں تک کی پروا اور فکر ہوتی ہے۔ اگر کوئی سیریس معاملہ

ہے تو آپ مجھ پر اعتبار کر سکتی ہیں۔ آپ کو مجھ سے مایوسی نہیں ہوگی۔“ اُس نے فراخ دلانہ ہنسی کی۔

”تمہیں سراسر بہت مہربانی۔ میں اپنے مسائل پینڈل کرنا جانتی ہوں۔“

”گور، مجھے لڑکیوں میں یولڈنٹس بہت اچھی لگتی ہے۔ لیکن آپ اس وقت بھی مجھ سے خوفزدہ لگ رہی ہیں..... کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“ اُس نے بہت سکون سے کہا۔

”نوسر! یہ بات نہیں۔ آپ اس کہیں میں آئے ہیں، تمام اشاف کے لوگ مجھے عجیب نگاہوں سے چوری چوری دیکھ رہے ہیں۔ ان معنی خیز نگاہوں اور چہ میگوئیوں کی آپ کے نزدیک کوئی حقیقت نہ ہو مگر سر، میں ٹڈل کلاس فیل سے قطع رکھتی ہوں، جہاں لڑکیوں کے ساتھ ایسی نگاہیں، ایسی باتیں منسوب ہو جائیں تو انہیں عزت اور غیرت کے نام پر زندہ دفن کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا جاتا۔“

”اوکے..... اوکے۔ فکر کی کوئی بات نہیں، یہاں سب ہماری عادت سے واقف ہیں۔ میں ورکرز کے علاوہ وائچ مین کے کہیں میں بیٹھا ہوا اکثر لوگوں کو نظر آتا ہوں۔ اپنی دسے، میری کوشش یہی ہوتی ہے کہ باس اور ورکرز کے درمیان فاصلے زیادہ نہ ہوں تو بہتر ہے۔ ورکرز جب ہم سے اپنے پرائمر شیئر کریں گے تو ہم ہیلپ کریں گے اور جب پرائمر حل ہوں گی تو ورکرز اپنا کام یکسوئی اور پرسکون انداز میں کر سکیں گے۔ اور جب کام وقت پر اور بہتر انداز میں مکمل ہوگا تو ہمیں اور ورکرز سب کو فائدہ ہوگا۔“ اس نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

خضریٰ خاموش رہی۔ وہ اُس کی حاضر جوانی کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ بھی اسے اپنا کام دھیان سے کرنے کی تلقین کر کے چلا گیا تو گہرا سانس لے کر وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

”میں ہزار کے ٹکٹن آپ کس طرح پانچ ہزار میں خرید رہے ہیں؟“ اُس نے شدید حیرانی سے ڈکاندار کی طرف دیکھ کر کہا تھا جس نے نہ معلوم کس کس چیز کو کاٹ کر حساب بنایا تھا۔

”بی بی! اس رسید پر میں نے سب لکھ دیا ہے۔ سونے کی رقم آپ کو دے رہے ہیں۔“

”کیا اتنا کم سونا استعمال ہوا ہے ان میں؟ اور گننے تو دیکھیں آپ، کتنے قیمتی اور بے حساب گلے ہوئے ہیں۔ کیا ان کی کوئی قیمت نہیں ہے؟“

”گلیوں کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ صرف سونے کی قیمت ہوتی ہے۔ ان دنوں تو سونے کے دام بھی گرے ہوئے ہیں۔ ان کڑوں میں سونے سے زیادہ کھوٹ ملا ہوا ہے۔“

”واو! یہ اچھا انصاف ہے آپ لوگوں کا۔ جب ہم خریدتے ہیں تو کھوٹ، ٹانگوں، گلیوں سب کی قیمت آپ ڈگنی چوگنی وصول کرتے ہیں۔ اور جب آپ خریدتے ہیں تو صرف سونے کی قیمت دے دیتے ہیں، وہ بھی چوتھائی حصہ۔“ شدید دکھ اور غصے سے اُس کی آواز بلند ہو گئی تھی۔

”دیکھیں بی بی! اگر آپ کو انہیں فروخت کرنا ہے تو میں آپ کو صرف پانچ سو روپے بڑھا کر دے سکتا ہوں۔ اگر آپ کو سودا منظور ہے تو بولیں۔“ ڈکاندار نے کاروباری انداز میں کہا۔ وہ شش و پنج میں پڑ گئی۔ کئی ڈکانداروں سے معلوم کر کے یہاں آئی تھی، کوئی بھی کاروبار مانہ پڑنے کے باعث خریدنے کو تیار نہ تھا۔ یہ چوہدری شاپ شہر کی مشہور شاپ تھی۔ وہ یہ سوچ کر آئی تھی کہ یہاں ان کڑوں کی قیمت اچھی مل جائے گی۔ اب نہ معلوم اس کا وقت خراب تھا یا ڈکاندار اس کی مجبوری بجانب گیا تھا جو سودا منی کے دام خرید رہا تھا۔

”بی بی! لے جائیں انہیں۔ مگر سے سوچ سمجھ کر فیصلہ کر کے آئیے گا۔ ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ گھنٹوں بیٹھے آپ کے فیصلے کا انتظار کریں۔ دوبارہ اگر آپ آئیں تو صرف پانچ ہزار ملیں گے، پانچ سو کی آخر ختم ہو جائے گی۔“ ڈکاندار نے تند انداز میں کہتے ہوئے ٹکٹن اُس کی طرف بڑھا دیئے اور دوسرے کسٹمر کی جانب بڑھ گیا۔ اس سے بات کرتے وقت اُس کا لہجہ اتنا تند و تحقیر آمیز تھا گویا وہ ٹکٹن فروخت کرنے نہیں، بلکہ

مانگتے آئی ہے۔ اور اب اس ماڈرن لڑکی سے بات کرتے وقت اس کا انداز کے لہجے میں اس قدر چاشنی اور احرام و ادب آگیا تھا کہ لگتا تھا وہ شخص شیریں گفتاری و شائستگی کا پیکر ہے۔ ایسا ہی ہوتا ہے، مجبور کی بے بسی ہر جگہ ہی اسے بے مول کر ڈالتی ہے۔ وہ مجبور تھی۔ یہاں زیور خریدنے نہیں بیچنے آئی تھی، اس لئے بے وقعت و حقیر تھی۔ اگر اس کے پرس میں بھی نوٹوں کی ہریالی چھائی ہوتی تو وہ بھی سب کے لئے باعث احرام ہوتی۔ اس نے بالآخر فیصلہ کر ہی لیا کہ ننگن فروخت کر دے گی۔ رشتوں سے وابستگی غول کی روانی میں دوڑتی ہے، ماں دنیا سے جا کر نگاہوں سے دور ہوئی تھی، مگر دل و نگاہ کی دنیا میں ہنوز بستی تھی۔ کنگٹوں سے جدائی اس کی اور ماں کی محبت میں کوئی فرق پیدا نہیں کر سکتی تھی۔

لیکن پھر بھی ننگن فروخت کرتے وقت رقم ہاتھ میں لے کر اس کے اندر نوٹ پھوٹ شروع ہو گئی تھی، کانپتے ہاتھوں سے رقم پرس میں رکھ کر آنکھوں میں اُٹھ آنے والے آنسوؤں کی نمی جذب کرنے کی کوشش میں وہ ادھر ادھر دیکھے بیامیٹ کی طرف بڑھ گئی۔ جذبات کی ڈوبتی کشتی میں سوار وہ یہ بھی نہ دیکھ سکی کہ اس کے برابر میں کھڑی ماڈرن لڑکی کو ڈائمنڈ کا ٹیکس دلواتے ہوئے اس شخص کی نگاہوں نے بہت دور تک اس کا پیچھا کیا تھا۔

”آخر تم نے اپنی ماں کی آخری نشانی کو بھی جدا کر دیا“ انابی نے روپے ہاتھ میں لے کر اس کے ستے ہوئے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے رنجیدگی سے کہا۔

”امی کی آخری نشانی تو میں ہوں انابی..... آپ اعتراض کریں گی، اس وجہ سے خاموشی سے ننگن نکال کر لے گئی تھی۔ انابی! محبتوں کے رشتے بے جان چیزوں سے نہیں روح سے وابستہ ہوتے ہیں۔ انسان تو فانی ہے، آج مرا کل مٹی ہو گیا۔ روحیں لازوال ہوتی ہیں۔

خلوص کے رونا ہوا!

پیاز و مروت کے بندھن!
محبتوں کے تعلقات!

لازوال ہوتے ہیں، روحوں کی طرح جو کبھی نہیں مرتے، ہر آن ہماری دھڑکن میں کر دل میں دھڑکتے ہیں، ہماری حیات کو بوقت ضرورت از سر نو تازگی و ولولہ، سرخوشی بخشتے ہیں۔ یہ روپے لے کر اس شخص کے منہ پر مار کر آئیں اور کہہ کر آئیں، روپے خود آپ وہاں پہنچا دیا کریں گی، اُسے یہاں آنے کی ضرورت ہرگز نہیں ہے۔“

”اچھا دے آؤں گی۔ صبح تم آفس جاؤ گی تو میں اس کے گھر چلی جاؤں گی۔ تم منہ ہاتھ دھو لو، فریش ہو جاؤ۔ میں کھانا لگاتی ہوں۔ آج میں نے ٹماٹر کی پختی اور سٹر پلاؤ پکایا ہے۔ تمہیں بہت پسند ہے نا؟“ انہوں نے ہمیشہ کی طرح اُسے بہلانے کی سعی کی۔ وہ بھی جبراً مسکراتی ہوئی اٹھی تھی۔

دوسرے دن صبح آفس میں اُس کے لئے دھماکہ خیز خبر موجود تھی۔

”مٹھائی کھلاؤ ڈیر! مٹھائی۔ سر نے تمہیں اپنی پرسنل سیکرٹری اپائنٹ کر لیا ہے۔ یہ رہا لیڈر تمہارا۔ آج سے تمہیں اس کہن میں نہیں بلکہ سر کے ساتھ ان کے روم میں بیٹھنا ہے۔“ اُسے اندر آتا دیکھتے ہی غائبہ کھڑی ہو کر بڑے جوش لہجے میں بولی۔

”وہاٹ؟ کیا مقصد؟ کیا کہہ رہی ہو؟“

”سر نے ابھی بریف کیا ہے کہ آج سے تم ان کی پرسنل سیکرٹری کی سیٹ پر بیٹھو گی، ان کے سیکرٹری صاحب درکنگ ڈیپارٹمنٹ میں شفٹ کر دیئے گئے ہیں۔ ان کی سیٹ تم سنبھالو گی، واو! اب تمہارے بھی نصیب کھل جائیں گے۔ اچھے وقت میں ہم جیسے لوگوں کو یاد رکھنا۔“

”پلیز..... پلیز ثانیہ! میری سمجھ میں نہیں آرہا یہ اچانک ہی ہوا کیا؟ کل تک تو ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ پھر اتنی۔“

”اب حیرانی ختم بھی کر دیا! تم نے سنا نہیں کہ جب اللہ دیتا ہے تو پیچھے پھاڑ کر دیتا ہے۔“

”جی..... میں اب یہ جاب برقرار نہیں رکھ سکتی۔“ اُس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔
 ”اوکے، ایز یوش..... لیکن ہمارا ایک اصول ہے۔ ہم جہاں اپنے ورکرز کو بے
 حساب مراعات دیتے ہیں، وہاں ہم بلا سبب ریزائن کرنے والوں سے ہرجاں بھی لیتے
 ہیں۔ آپ یہ رقم دے دیجئے اور شوق سے ریزائن دے جائیے۔“ اُس نے ایک سلیپ
 آگے بڑھائی۔

”اتنی بڑی رقم، مائی گاڈ! یہ اصول نہیں، بے انصافی ہے۔ اور جاب دیتے وقت تو یہ
 اصول نہیں بتایا گیا تھا۔“ غصہ، رنج، تاسف اُس کی آواز اور چہرے سے عیاں تھے۔
 ”آپ نے اس وقت جاننے کی ضرورت بھی محسوس نہ کی ہوگی۔“ اُس کے ٹھنڈے
 لہجے میں ٹھٹھکی کاٹ شامل تھی۔ خطرئی کو پورا کمرہ گھومتا ہوا لگ رہا تھا۔

”میں..... میں اتنی بڑی رقم نہیں دے سکتی۔ کیا کوئی دوسرا اصول نہیں ہے؟“
 ”ہے۔ ہر ورکر کے لئے لازمی ہے کہ وہ ریزائن کرنے سے تین ماہ قبل آگاہ کرے
 تاکہ اتنے عرصے میں ہم نئے ورکر کو اپائنٹ کر سکیں۔ اگر آپ رقم نہیں دے سکتی ہیں تو
 پھر تین ماہ ویٹ کریں۔“

”لیکن میں یہاں ایک دن بھی جاب کرنا نہیں چاہتی اب۔“
 ”ہوں، یہاں جاب نہیں کریں گی تو آپ کو کہیں جاب کرنے نہیں دیا جائے گا اور
 آپ کمپنی کو ہر جانے ادا کئے جا گئے بھی نہیں بیٹھ سکتیں۔“ اُس کا لہجہ سپاٹ مگر اٹل تھا۔
 ”آپ مجھے دھمکی دے رہے ہیں؟“
 ”جو آپ سمجھیں۔“

وہ سخت تذبذب کا شکار تھی۔ جاب کی اُسے سخت ترین ضرورت تھی۔ بلاشبہ یہاں
 سیکریٹریز بدست تھی لیکن ملازمت کر نہیں سکتی تھی تو چھوڑ بھی نہیں سکتی تھی۔ بہت کڑی
 شرط تھی، پھر دھمکی بھی۔ اور اتنا اثر و رسوخ والا بندہ واقعی اُسے کہیں جاب نہ ملنے دیتا۔
 ٹھیک ہے، تین ماہ جبراً جاب کر لوں گی۔ مگر شانزل خان، تمہیں بتا دوں گی کہ میں ان گھنیا
 اور حیا فروش لڑکیوں میں سے نہیں ہوں جنہیں تم اپنی دولت سے زیر کرتے ہو۔

”ٹٹ اپ، خوش ہوتے وقت تمہیں ذرا احساس نہیں کہ وہ شخص کس کیریکٹر کا
 مالک ہے اور تم جانتی ہو وہ بلاوجہ کسی پر مہربان نہیں ہوتا۔ میں ریزائن کر دوں گی۔ مجھ
 سے یہ گھنیا اور ذلیل جاب ہرگز نہیں ہوگی۔ شرمیلا، جھپڑ، روحیلہ یا مادگریت وغیرہ نہیں
 ہوں میں۔“

”میں نے تمہیں یہ بھی بتایا تھا کہ سرکسی کو زبردستی حاصل نہیں کرتے اور تم نے ہی تو
 کہا تھا کہ اگر عورت بکنا نہ چاہے تو دنیا کا کوئی بھی مرد اسے خرید نہیں سکتا۔“ غائب نے
 اس کی بات سے ہی اسے قائل کرنا چاہا مگر وہ خاموشی سے استغنیٰ ٹائپ کرتی رہی۔ اب
 وہ اسے کیا بتاتی کہ وہ اس کی آنکھوں میں کچھ ایسا چمک دیکھ چکی تھی جس چمک کو وہ کوئی
 نام تو نہ دے پائی تھی مگر اس کے لاشعور میں کچھ ہونے، کسی بڑی تباہ کن گڑبڑ ہونے کا
 ادراک جاگ اٹھا تھا۔ وہ شخص چہرے پر سنے کا ماہر تھا اور کل یقیناً وہ اُس کی پریشانی
 بھانپ گیا تھا۔ جیسی بڑے اصرار سے کہہ رہا تھا کہ اگر کوئی پریشانی ہے تو وہ مدد کرے گا۔
 اور اس کے انکار پر اُس کے چہرے پر ناگواری و دھمکی کے سائے لمحے بھر کو چھا کر
 غائب ہو گئے تھے۔

”اوہ، سر کی بات سن کر میں انٹرکام آف کرنا بھول گئی۔“ انٹرکام پر نگاہ پڑتے ہی
 چائیر گھبرا کر بولی تھی۔ لیکن خطرئی کہیں سے جا چکی تھی۔

شانزل خان نے جھٹکے سے انٹرکام کا ریسیور چنا تھا۔ اُس کا دوجہ چہرہ غصے اور ضبط
 سے سرخ ہو رہا تھا، چند لمحے اُسے اپنی اضطرابی کیفیت پر کنٹرول کرنے میں لگے۔ اُس
 نے دل میں کوئی فیصلہ کیا اور اگلی ساعت وہ بالکل بر سکون تھا۔ جنون و اشتعال انگیزی
 بالکل غائب ہو گئی تھی۔

”آئی ایم کم ان سر۔“ سامنے خطرئی نے آکر اجازت طلب کی اور اُس کے ”ایس“
 کہنے پر اندر آکر اپنا استغنیٰ اُس کے سامنے رکھ دیا۔
 ”ریزائن کر رہی ہیں آپ؟“ شانزل خان نے پچہ کی جاب نگاہ ڈالے بے خطرئی
 کی طرف گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے ہارل انداز میں کہا۔

روپے کی ادائیگی لکھی ہوئی تھی۔ میں خود حیران رہ گئی کہ اپنے ہاتھ سے میں ہزاروں روپیہ اسے پچھلے سال سے دے رہی ہوں۔ میں نے بہت کہا مگر وہ جھوٹا، مکار اور دغا باز ہے۔“

”آف..... آزمائش در آزمائش کا یہ سلسلہ کب ختم ہوگا؟ میں تھک گئی ہوں انا بی! مظلوم و مجبور حالات کے بے رحم چھیڑے کھاتی ہم جیسی لڑکیاں جن کے سر پر نہ باپ کی پناہ کی محبت ہے اور نہ بھائی کے تحفظ کا حصار، اس مردوں کے معاشرے میں رافع فیاض جیسے لالچی، شائزل خان جیسے ہوس پرست دولت اور ناجائز اختیارات کے زعم میں خود کو خدا سمجھنے والوں سے کس طرح بچ کر نکلا جائے کہ یہ لوگ ہر قدم پر مٹی کے ذروں کی طرح بکھرے ہوئے ہیں۔“ بے بسی کے احساس سے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

”روڈ نہیں میری بچی۔ اسے تم تو میرا سہارا ہو، میری اُمید و یقین کی روشنی۔ کوئی ماں اتنا غم تو اپنے درجن بھر بیٹوں پر نہیں کرتی جتنا مجھے تباہ کر رہا ہے۔ بنی! زندگی سیدھی سڑک کی مانند نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو ایک ایسا راستہ ہے جہاں راہ میں خاردار بھی آئیں گے، کہیں فلک کو چھوتی ہوئی چوٹیاں، کہیں اندھی گہری کھائیاں اور سبزہ و خوشحالی بھی تمہاری راہ میں آئے گی۔ یہ سب شاہراہ حیات کے موڑ ہوتے ہیں۔ نا اُمیدی تو کفر ہے میری بچی۔“ انا بی نے اُسے سینے سے لگایا تو اس کے اندر بھرکتی آگ پر یکدم ہی شبنم کی نرم نرم پھواری گرنے لگی۔ رگ و پے میں آسودگی اور طمانیت سکون بن کر دوڑنے لگی۔ وہ کتنی ہی دیر معصوم سی بچی کی طرح ان کے سینے سے لگی رہی۔ سچ ہے، محبت اور اپنائیت کی مشاس صرف خون کے رشتوں میں ہی نہیں دوڑتی، بے غرض و بے لوث محبت خون کے رشتوں پر بھی حاوی ہو جاتی ہے۔

ایک ہفتہ ہو چکا تھا اُسے شائزل خان کی بیکری کی سیٹ پر کام کرتے ہوئے۔ ان دنوں میں کوئی ایسی بات نہیں ہوئی تھی جس سے وہ خوفزدہ تھی۔ کام بھی ایسا کوئی خاص محنت طلب یا مشکل نہیں تھا۔ سارا دن اُس کے آفس سے ملحق شیشے کے کیمین میں بیٹھے

”مجھے کیا کام کرنا ہوگا؟“ اُس نے ہتھیار ڈالتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔
”وہ..... میرے موڈ پر منحصر ہے۔“ اُس کی نگاہوں میں ناخاندانہ چمک اور ہونٹوں پر گہری شہسوارانہ مسکراہٹ تھی۔ گویا کہہ رہا ہو اتنی جلدی شکست تسلیم کر لی۔

”اللہ کی ماریں کم بختوں اور جھوٹوں پر۔ پہلے تو جھوٹ بول کر گناہ کے خوف سے لوگ مہر جایا کرتے تھے، اب ناچاروں کو چھینک تک نہیں آتی، گناہ کا تصور ذہنوں سے اس طرح مٹا ہے کہ گناہ کو گناہ سمجھتے ہی نہیں۔“

”کیا ہوا؟“ اُس نے چہرے سے ہاتھ ہٹا کر انا بی کی طرف غور سے دیکھا۔
”آج گئی تھی میں رافع فیاض کو روپے دینے۔ کہنے لگا اس طرح کام نہیں چلے گا۔ میرا سارا روپیہ تم لوگ تو ذکر دے رہے ہو، اس طرح میرا بہت نقصان ہو رہا ہے۔ بس اب میرے صبر کی حد ختم ہو گئی، دو ماہ کے اندر اندر اس کی رقم اسے مل جانی چاہئے۔ ورنہ..... وہ.....“ انا بی کو احساس ہوا کہ حضری کو سب سچ نہیں بتانا چاہئے۔ وہ پہلے ہی بہت پریشان و فکر مند لگ رہی تھی۔

”ورنہ کیا کرے گا وہ؟ بتائیں انا بی۔“ وہ ایک دم متوجش سی کھڑی ہو گئی تھی۔
”ارے چھوڑو، وہ یونہی بکواس کرتا ہے۔ میں تمہارے لئے چائے لاؤں۔“
”نہیں۔ آپ بات پوری کریں، سچ بتائیں۔ کیونکہ آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ جھوٹ بولنے والے پر اللہ کی لعنت ہوتی ہے۔“ اُس نے انہیں قریب بٹھاتے ہوئے کہا۔

”کیا کہے گا بد ذات اس کے علاوہ کہ اگر دو ماہ میں اس کی رقم پوری نہ ہوئی تو وہ تمہیں اٹھوا لے گا۔ لیکن تم گھبراؤ نہیں، اس کی جرأت نہیں ہے۔ مجھے تو فکر اس بات کی ہے کہ دو ماہ میں ایک لاکھ سے زیادہ کی رقم ہم کس طرح دے سکیں گے؟“

”اُس کی کل رقم ستر ہزار ہیں ادا کرتی ہے۔ پھر یہ لاکھ سے زیادہ کا کیا مطلب؟“
”میں نے بھی یہی کہا تھا۔ مگر اُس نے مجھے رسیدیں دکھائیں تو اس میں بہت کم

جہاں ایسی پارٹیز ہوں وہاں تو بہت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہر کیف آئیے۔“ وہ گویا جبراً اُسے میننگ روم میں لے کر داخل ہوا تھا۔ میننگ کا دورانیہ پندرہ منٹ پر مشتمل تھا۔ اس کے بعد بہت پر تکلف ڈنر تھا۔ ہال رنگین روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔

”سرا اب میں جاؤں گی۔“ اُس نے یہاں سے جانے میں عافیت سمجھی۔

”ہماری کمپنی کو اتنا وڈر فل آرڈر ملا ہے، جس میں ہمیں کروڑوں کی بچت ہے۔ کیا آپ اس خوشی کو تسلیم نہ کریں گی؟“ اُس نے جبرانی سے استفسار کیا تھا۔

”خوشیاں منانے اور شکر ادا کرنے کے سب کے اپنے اپنے انداز ہوتے ہیں۔ میں ہمیشہ شکرانے کے نفل پڑھ کر اور خوشی کے آنسو بہا کر خوشیاں منانے کی عادی ہوں۔“

”اوکے، کھانا تو کھا لیجئے۔“ اُس کے لہجے میں پُر خلوص اصرار تھا۔

”نہیں سر۔ کھانا تو آج میں نے جلدی کھا لیا تھا۔ یہاں آنے کی وجہ سے۔ ہارہ بیج بچے ہیں، مگر پرانا بی بی پریشان ہو رہی ہوں گی۔ آپ مجھے گھر چھڑوا دیجئے۔“ مظلوم اُس کے دل میں کیا تھا کہ وہ چند ساتھیوں سے اُڑھ کبریٰ لگا ہوں سے اُس کے چہرے کی جانب دیکھتا رہا اور پھر گہرا سانس لے کر ڈرائیور کو بلا کر اُسے گھر چھوڑ آنے کا حکم دے دیا۔

”صاحب امینڈر ہٹ یا ڈیفنس؟“ ڈرائیور نے آہستگی سے متنی خیز لہجے میں پوچھا۔ ”جہاں سے انہیں لے کر آئے ہو وہاں۔“ شانزل کے جواب پر ڈرائیور کے چہرے پر ازحد حیرانی کے تاثرات پھیل گئے تھے۔ پہلی مرتبہ ایسا ہوا تھا کہ کوئی لڑکی گھر سے آکر واپس گھر جا رہی تھی۔ ورنہ شانزل خان کے ساتھ آنے والی لڑکیوں کا ٹھکانہ شانزل خان کی مخصوص جگہوں پر ہوتا تھا۔ خضریٰ اُس کی سوچوں سے بے خبر خیریت سے گھر جانے پر اپنے رب کا شکر ادا کر رہی تھی کہ اگر شانزل خان زبردستی پارٹی کے اختتام تک روک لیتا تو وہ مجبور ہو جاتی۔

”یہ میری آخری وارننگ ہے خضریٰ جی! مجھے دو ماہ کے اندر اندر اپنی بقایا رقم مل جانی

چاہئے۔ آخر میرا ورثہ داشت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ میں اب قطعی صبر نہیں کر سکتا۔“ رافع فیاض نے آتے ہی سخت غصے میں چیخنے ہوئے کہنا شروع کیا۔

”آہستہ بات کرو۔ یہاں مہذب لوگ رہتے ہیں۔ جب تمہیں کہہ دیا کہ رقم تمہیں مل جائے گی تو پھر کیوں بے مبرے ہو رہے ہو؟“ خضریٰ اُس سے زیادہ دہنگ لہجے میں بولی۔

”کچھ تو اللہ کا خوف کرو رافع میاں! اوکے ہم نے تمہیں شریف آدمی جان کر رقم پر بھروسہ کیا اور رقم دیتے وقت کوئی رسید اپنے پاس نہیں رکھی اور تم نے بچے بے ایمان ہونے کا ثبوت دے کر ہمیں مزید ترسے کے بوجھ سے لا دیا۔ بہت افسوس کی بات ہے، موت کا تو خوف ہی نہیں ہے تمہیں۔ زندگی کا کیا بھروسہ نہ معلوم کب سانس بند ہو جائے تو سب مال و دولت یہیں پڑا رہ جائے گا۔ ساتھ میں صرف ایمان اور اعمال جائیں گے۔“ انابی جو بہت دھوکہ فارغ ہوئی تھیں گیلے ہاتھ تو لیے سے صاف کرتی ہوئی وہاں آکر اس سے مخاطب ہوئیں۔

”میری موت کی نہیں، اپنی موت کی فکر کر بیٹھیا۔ مرنے کی عمر تیری ہے میری نہیں۔“

”دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ ورنہ تمہارا سر پھاڑ دوں گی۔“ خضریٰ پُر طیش انداز میں صحن میں رکھی سل کے بے کی طرف بڑھی تھی۔ اگر انابی اسے تیزی سے پکڑ نہ لیتیں تو وہ یقیناً یہ سب کر گزرتی۔ رافع فیاض کی بدتمیزی نے اسے ازحد مشتعل کر ڈالا تھا۔

”کیوں اس بد ذات کے خون سے اپنے ہاتھ گندے کرنا چاہتی ہو بیٹی۔ اگر اس میں ذرا سی بھی غیرت وحیا ہوتی تو یہ تمہیں اٹھوانے کی بات ہی کیوں کرتا۔ اور نہ اس طرح ڈھٹائی سے آکر اپنی بے ایمانی کا مظاہرہ کرتا۔“ انابی خضریٰ کے سر پر ہاتھ رکھے کہہ رہی تھیں۔

”میری رقم مجھے مقررہ وقت تک نہ ملی تو پھر دیکھنا میں کیسا بندہ ہوں۔“ وہ دھمکیاں دیتا ہوا وہاں سے روانہ ہو گیا۔ انابی دروازہ بند کر کے آئیں تو وہ خاموش صوفے پر بیٹھی

تھی۔

”انا بی اکرائے دار سے کہہ کر کرائے کے روپے لیں، سال سے زیادہ ہونے والا ہے۔ اب میں اسے کوئی رعایت دینے پر تیار نہیں۔ چلیں میرے ساتھ اوپر۔“ وہ انہیں لے کر پچھلی گلی کے گیٹ سے باہر نکل آئی۔ کیونکہ اوپر کے پورشن کا گیٹ پچھلی گلی میں تھا اور نیچے کے جس جھے میں وہ اور انا بی رہائش پذیر تھیں، وہ فرنٹ سائیڈ پر تھا۔ اس طرح دونوں کا آسنا سامنا نہیں ہوتا تھا۔ جب بھی کوئی کام ہوتا، انا بی یا کرائے دار کے بیوی بچے ایک دوسرے کے پاس آ جایا کرتے تھے۔ یہ نکتہ عملی انا بی کی تھی۔ وہ دونوں کسی مرد کی موجودگی کے بغیر رہ رہی تھیں اور نہیں چاہتی تھیں کہ کسی کو انکی اٹھانے کا موقع ملے۔

میزھیاں چڑھ کر اوپر آئیں تو گیٹ ہاتھ لگاتے ہی پورا نکل گیا۔ گھر سٹائے کی زد میں تھا۔ وہ حیران حیران ہی اندر چلی آئیں۔ گیلری، کمرے، کچن، ہاتھ روم سب خالی تھے۔ ہر طرف ویرانی اور سٹائے کا راج تھا۔ نہ وہاں کوئی سامان تھا اور نہ ہی کرائے دار۔ چند لمبے شاکہ کیفیت میں وہ کھڑی کی کھڑی رو گئیں۔

”یہ لوگ کب گھر خالی کر گئے؟ اور بتا کر بھی نہیں گئے؟“

”ہائے اللہ! ایسا اندھیرا، ایسا فریب اور دغا! آنکھوں میں ڈھول جھونک گئے۔“
حضرتی کو زمین آسمان گردش کرتے نظر آئے ہی تھے، انا بی کی آنکھوں میں بھی مارے پریشانی ورنج کے اندھیرا چھانے لگا۔ چند روپیے کا کرایہ چڑھا ہوا تھا جس کی کل رقم میں ہزار روپے کے لگ بھگ بنتی تھی۔

”ارے لوٹ لے گئے ہمیں، ان کا بیڑہ فرق ہو، کیسے معصوم و شریف نظر آتے تھے میاں بیوی دونوں۔ اندر سے کس قدر خبیث لگے، کیسے خاموشی سے نکل گئے۔“ انا بی کے جھرجھر آنسو بہنے لگے۔

”کتنی بار میں نے آپ سے کہا انا بی کہ ان لوگوں کی باتوں کا اعتبار نہ کریں۔ بھلا ایسا بھی کہیں ہوتا ہے کہ کسی کرائے دار سے چند روپیہ مانگ کر ایہ وصول نہ کیا جائے؟“

”ہم نے تو مثال قائم کر دی تھی، ہم نے ہمدردی و اللہ کے خوف سے اس کی باتوں پر یقین کیا جو اب بے وقوفی و پاگل پن کہلائے گی۔ اب کیا کریں؟ کہاں ڈھونڈیں انہیں؟“

”انا بی! آپ گھر میں نہیں تھیں کیا؟ جب وہ سامان لے کر گئے ہوں گے تو آواز تو آئی ہوگی۔ اور سٹے سے کسی نے بھی انہیں جاتے ہوئے نہیں دیکھا کیا؟“
”سٹے والوں سے اتنے تعلقات کہاں ہیں۔ ٹھہرو میں سامنے والی سے معلوم کر کے آتی ہوں۔ اسے میں اکثر دروازے، کھڑکی سے جھانکتے دیکھتی ہوں۔ اس نے ضرور دیکھا ہوگا۔“

”پہلے منہ ہاتھ دھو لیں، پھر میں بھی آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔“
”بھائو میں گئے منہ ہاتھ۔ میرے اندر آگ لگ رہی ہے۔ کس طرح لٹ گئے ہم لوگ۔ میں ہی بے وقوف تھی، کم عقل تھی۔ تم نے کتنا سبھایا بیٹی کہ نہ آؤں کرائے دار کی باتوں میں۔ ساری غلطی میری تھی۔ کیوں کرائے دار کی بیوی کی باتوں میں آئی۔ کیسے جھوٹے دلا سے دیتی تھی کجنت، مکار، آپا میری کینٹی چل رہی ہے پچاس ہزار کی۔ آپ کے کرائے کے روپے میں کینٹی میں بھر رہی ہوں۔ اگلے اپریل میں کینٹی مل جائے گی تو آپ کو کرائے کی بندھی رقم ایک دم مل جائے گی۔ اور باقی رقم میں لے لوں گی۔ میرے لئے یہ اچھی بات تھی کہ بڑی رقم یکمشت مجھے مل رہی تھی۔ میں نے تمہیں اس لئے نہیں بتایا کہ تم نہیں مانو گی۔ کاش میں تمہیں بتا ہی دیتی تو شاید ایسا نہیں ہوتا۔ میں نے بھی سوچا کہ رافع فیاض کو اتنی بڑی رقم مل جائے گی تو وہ بار بار تنگ نہیں کرے گا۔ مگر ہائے ری قسمت، جب عقل پر چتر پڑے ہوں تو قسمت بھی سیاہ ہو جاتی ہے۔“

سامنے والی پڑوسن سے معلوم ہوا کہ وہ کرائے دار کو روزانہ تھوڑا تھوڑا سامان لے جاتے ہوئے ایک ہفتے سے دیکھ رہی تھی۔ اس وقت جب وہ گھر میں نہیں ہوتی تھیں۔ دوپہر کے وقت گلی بھی سنسان رہتی تھی۔ کل دوپہر کو وہ سب ٹیکسی میں بیٹھ گئے، تب اس کے پوچھنے پر بتایا کہ وہ دوسرے گھر میں شفٹ ہو رہے ہیں، یہ گھر خالی کر دیا ہے۔

”کرائے دار کا معاملہ میں نے رات ہی اللہ کے سپرد کر دیا تھا اور یقین جانتے ایسا کر کے میرے اندر کچھ ایسا روحانی سکون اور طمانیت اُتری ہے کہ مجھے اب ملال بھی نہیں ہو رہا۔“

”بے شک..... جب ہم اپنے رب کو دل سے محسوس کرتے ہیں تو اس کی موجودگی کا احساس اس طرح روح اور جسم کو بے سکون و بے نیاز کر دیتا ہے۔“

”انا بی! کچھ ایسا ہے ضرور جو آپ مجھ سے چھپا رہی ہیں۔ پلیز..... آپ ابھی کچھ نہیں بولیں، پہلے میری بات سنیں۔“ اُس نے اُن کی طرف دیکھتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

”میرے آفس جانے کے بعد آپ روزانہ کہاں جاتی ہیں؟ پھر میری واپسی سے قبل آ جاتی ہیں۔“

”میں..... میں کہاں جاؤں گی بیٹی۔ اور روز روز کہاں جا سکتی ہوں؟“

”میری طرف دیکھ کر کہیں انا بی۔ آپ کی نگاہیں آپ کی آواز کا ساتھ کیوں نہیں دے رہیں؟ اور کل رات سامنے والی پڑوسن نے بھی یہی کہا تھا کہ تم دونوں کے گھر سے جانے کے بعد کرائے دار سامان لے کر جاتا رہا ہے۔ اور ہوا بھی ایسا ہی ہے۔ میں نے آپ سے پوچھا کہ وہ اوپر سے سامان لے کر گئے ہوں گے تو آپ کو آدازیں نہیں آئیں؟ کیونکہ چھت ایک ہونے کے باعث بچے کے چھوٹے چھوٹے کھلونے گرنے کی آواز بھی صاف سنائی دیتی ہے۔ آپ نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔“

”اگر تمہیں مجھ سے محبت ہے تو مجھ سے ابھی اس سوال کا جواب مت پوچھنا۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ ایک دن میں خود تم کو حقیقت بتا دوں گی۔“

ایک ماہ بعد شانزل خان کے تیر بدلتے لگے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ شرافت و بے نیازی کے لباس سے آزاد ہوتا جا رہا تھا۔ حضری کا ٹھوس اور بے چلک رویہ مضبوط کر دوار اُس کے لئے چیلنج بن چکا تھا۔ اس کی انہی پُر وقار خصوصیات نے پہلے دن ہی چو نکا دیا تھا

حقیقت جان کر انہیں بھی افسوس ہوا کہ انہیں معلوم ہوتا تو وہ انہیں قطعی جانے نہیں دیتیں۔

وہ سازی رات ان کی سوتے جاگتے پریشانی میں گزری۔ نئے کرائے دار کو گھر دینے سے وہ از حد خوفزدہ ہو گئی تھیں۔ عورتیں اگر مرد کی سرپرستی میں نہ ہوں تو ہزار بھی ہوں تو تنہا کہلاتی ہیں پھر وہ تو صرف وہ تھیں۔ اس وقت وہ تنہی دامن، تنہی دست تھیں۔ چاروں طرف سے مصائب و پریشانیوں کے عفریت منہ پھانڑے ان کی سمت دوڑ رہے تھے جن میں سب سے قریب تر عفریت رافع فیاض تھا جو اپنی تمام تر خیاثتوں اور کینکلیوں کے باوجود مضبوط حیثیت رکھتا تھا۔

انا بی عمر کے اس دور میں تھیں جہاں معمولی سی پریشانی و فکر اعصاب کو تہہ و بالا کر ڈالتی ہے اور ان کو گتے والا دھچکا تو ان کے اعصابی اعتبار سے بہت زیادہ تھا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بائی بلڈ پریش کے ساتھ انہیں بخار نے بھی جکڑ لیا تھا۔ حضری اگر فوراً ڈاکٹر کے پاس نہ لے جاتی تو نہ معلوم کیا ہوتا۔ صبح تک ان کے بخار اور بلڈ پریش میں خاصی کمی آئی تھی۔

”لوگ اپنی خود غرضی و مفاد پرستی کے آگے یہ نہیں سوچتے کہ ان کی کینی حرکتوں کے باعث کچھ لوگ جیسے ہی مر جاتے ہیں۔“ اُس نے زبردستی انا بی کو ناشتہ کراتے ہوئے سوچا۔

”تم بھی ناشتہ کرو۔ رات سے کچھ بھی نہیں کھایا۔ شکر ہے آج چھٹی کا دن ہے۔ کس طرح آفس جاتیں۔ میرے سامنے بیٹھ کر ناشتہ کرو تا کہ مجھے سکون ملے۔“

ان کے سامنے بیٹھ کر ایک سلاکس اُس نے چائے سے کھایا۔ دونوں کپ، کیتلی اور ٹائیس دھو کر اُن کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔

”کیا سوچ رہی ہو؟ میرے گھر اب ہمارا فیصلہ اللہ کی عدالت میں ہو گا۔ وہ ہم سے چھپ گیا، لیکن اللہ سے کس طرح چھپے گا۔“ انہوں نے اس کا سر سینے سے لگاتے ہوئے گلو کیر لچے میں کہا۔

شانزل خان کو۔ اس خاموش اور ارد گرد سے بیگانہ لڑکی میں کوئی تو خاص بات تھی جو اسے یہاں سب میں منفرد ظاہر کرتی تھی۔ وہ شخص جو گھاٹ گھاٹ کا پانی پیتے ہوئے، اول درجے کا کائیاں اور ذہین تھا، جس کا وقت زیادہ تر حسین رنگین لڑکیوں کے سنگ گزرتا تھا، جو جنس مخالف کو محض وقت گزاری کا ذریعہ سمجھتا تھا۔ بہت سی حسین لڑکیاں اس کی قربت کی خواہاں تھیں اور جنہیں وہ چند دنوں یا چند گھنٹوں سے زیادہ لٹ نہیں دیتا تھا، نہ چاہنے کے باوجود بلکہ بار بار جھلانے کے باوجود وہ اس لڑکی کے متعلق سوچنے لگا تھا جس کی کوئی بھی اور اسے ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ اسے یقین تھا، جس قدر وہ خود کو نیک پر وہیں ظاہر کرتی ہے، درحقیقت وہ ایسی نیک و پر دے دائرہ میں ہے۔ ایسے لوگ کھوکھلے و منافق ہوتے ہیں جو ظاہری طور پر مذہب پرستی کا پرچار کرتے ہیں لیکن ان کا باطن بالکل دین سے بے بہرہ و لاتعلقی ہوتا ہے۔ اسی غائب کی کچھ لڑکیاں اسے دو دہائی تعلیم ملی تھیں جن میں طوطی سرمد کے رنگ و رنگ ڈھنگ بالکل خضری کی کا پی تھے اور پہلا بار وہ دل سے جس لڑکی کی عزت و توقیر کرتا تھا۔ لیکن سادگی، شرافت، مصدیت و پاکیزگی کے رنگ اتنے کچے اور پھیکے ثابت ہوئے کہ بادش کی بیوندوں سے بھیگ کر اپنے بدنام و بد رنگ وجود کو ظاہر کر بیٹھے تھے۔ اس کے دل سے پھر ہمیشہ کے لئے نسوانیت کا وقار و عزت زائل ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ آزاد، بے باک اور پردے کی قیود سے آزاد لڑکیوں کو ان لڑکیوں سے بہتر سمجھتا تھا جو جیسی تھیں ویسی ہی نظر آتی تھیں۔ کم از کم ان لڑکیوں کی طرح دوسروں کا اعتماد، فخر و اعتبار کا خون تو نہیں کرتی تھیں۔ خضری حیات، طوطی سرمد جیسی لڑکیوں کی نیچر سے وہ بخوبی واقف تھا۔ وہ پہل بھی نہیں کرے گی بلکہ اس کی پیش قدمی کو بھی جبراً پسند کرے گی جو محض ظاہری طور پر ہوگا اور پھر جب پردہ گرے گا تو بڑی بڑی بے باک اور ماڈرن لڑکیاں بھی متحیر سی دانتوں میں آنکھیاں دبا کر رو جائیں گی۔

اس رات کو ہوٹل کے فنکشن پارٹی میں خضری کو بالکل سادہ سوٹ اور بڑی سی چادر میں سر سے پاؤں تک پیک دیکھ کر اس کا فیصلہ سب برا حال ہوا تھا مگر وہ مصطفیٰ ضبط کر گیا تھا

کہ اسے معلوم تھا ابتدا میں ایسا ہی ہوگا۔ وہ آہستہ آہستہ اصلیت پر آئے گی، پھر دوسرے دن اس نے چند سوٹ جو فیشن کے مطابق تھے، ڈرائیور کے ذریعے اسے بھجوائے کہ وہ ایسے سوٹ پہن کر آفس آیا کرے جو اس نے ڈرائیور کو خوب سنا کر واپس کر دیئے تھے۔ لیکن وہ اس طرح کے سب ہتھکنڈوں سے واقف تھا۔ بحال ہے جو ذرا بھی شرمندہ ہوا ہو بلکہ جلد ہی وہ اسے ساتھ ڈنر اور پھر لچ کی دعوت دے بیٹھا جو اس نے سہولت سے مسترد کر دی تھی اور یہی نہیں بلکہ اس کا رویہ شانزل کے ساتھ شک و از حد سپاٹ اور زوکھا ہو گیا۔ اس کی جھکی نگاہوں، کشادہ پیشانی و چہرے کے دلکش نقوش سے اس کے لئے نفرت و حقارت موملا دھار برسنے لگی تھی۔ بے تکلف تو وہ اس سے کبھی نہ تھی مگر اب اس کا حدود بچہ گرہ، احتیاط اور خاموشی چیخ کر اعلان کر رہی تھی کہ شانزل خان ایک بد قماش، آوارہ، بد کردار شخص ہے جس سے بچ کر چنا ہر شریف زادی کا اولین فرض تھا۔ یہ سب کچھ اس کے وقار، عزت و مردانگی کے منافی تھا۔ وہ ایک لڑکی جو معمولی سی حیثیت کی حامل تھی، اس کی ہٹ دھرمی اور رنگین مزاجی کے لئے ضد بن گئی تھی۔ اس نے بھی فیصلہ کر لیا تھا جب تک اس لڑکی کو اس کے اصل مقام پر لا کر نہیں چھوڑے گا جب تک باہر کی دنیا کا ہر عیش و آرام حرام تھا اس پر۔ بھلا اس لڑکی کی کیا حیثیت تھی؟

”خضری حیات! پلیز، میری ٹاکی کی ٹاٹ تھوڑی لوڑ کریں۔“ اس نے راکنگ چیئر سے سرٹکا کر بالکل ایزی انداز میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس کے سامنے بیٹھی خضری کا تیزی سے ڈائری پر چلتا قلم ٹھک کر ٹوک گیا۔ اس کے اس الٹے حکم پر اس کی فراخ پیشانی پر ناگواری پھیل گئی تھی۔

”سوری سر! میں صرف یہاں آفس کے کام کے لئے اپائنٹ ہوں۔ اپنے پرستار سے مجھے دور ہی رکھیں تو بہتر ہوگا۔“ وہ کوشش کے باوجود لہجے کی سختی دہانہ پائی۔

”ہوں! میں اس وقت آفس میں ہی ہوں اور یہاں آپ سے جو کام لیا جائے گا وہ آفس کا کام ہی ہوگا اور آپ کو کرنا پڑے گا۔“

”میں ایسا کوئی کام نہیں کر سکتی جو میری عزت، وقار کے منافی ہو۔“

”عزت، وقار کوڑیوں میں بکتا ہے میرے آگے۔“ اس کا لہجہ عقارت آمیز تھا۔

”آپ کا ابھی ایسی لڑکیوں سے واسطہ ہی کہاں پڑا ہے۔ آپ گھٹیا اور حقارت مند لڑکیوں سے شریف اور باعصمت لڑکیوں کو کپیئر نہ کریں۔“ وہ اس کی کوئی بات برداشت کرنے کو تیار نہ تھی۔

”ریٹ تو ہر لڑکی کا ہوتا ہے، صرف تازہ ادا میں فرق ہوتا ہے۔ کوئی ڈائریکٹ یا نبوں میں آجاتی ہے اور کوئی اپنی قیمت بڑھانے کے لئے نام نہاد شرافت و معصومیت کا پرچار کر کے مقابل کی آتش شوق کو بجھانے کا کرم نہ مانگی قیمت وصول کرتی ہے۔“

”ہر لڑکی ناٹ فار سیل ہوتی ہے سر۔ علاوہ آپ کی سوسائٹی میں سو کر کے والی کچھ لڑکیوں کے۔“

”اچھا گویا آپ یہ بتانا چاہ رہی ہیں کہ آپ ناٹ فار سیل ہیں۔ لیکن.....“ وہ اٹھ کر اس کے قریب چلا آیا جو غصے اور خنجر کے باعث پہلے ہی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”ڈیزسٹ! مجھے بھی ناٹ فار سیل چیزیں خریدنے کا زبردست ایکسپیرینس ہے۔ میں تمہارے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہتا ہوں۔ یہ بلیک بک ہے، یہاں جتنی چاہو رقم بھر سکتی ہو۔“ اس نے کوٹ کی جیب سے چیک بک نکال کر ٹیبل پر رکھی۔ اس نے جھک کر بیت بنی خضرئی کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے سرگوشیاں لہجے میں کہا اور دوسرے لمحے آفس کی خاموش پریسکون فضا میں زوردار چھڑکی گونج اور تعاقب پیدا کر گئی تھی۔ چھو لیسے تک تو وہ ساکت سا رہ گیا۔ ایک معمولی سی بے اوقات لڑکی اور اس کی یہ جرات۔ وہ غصہ تک سا آگے بڑھا۔

”خبردار، جو ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو۔“ اس نے پھیری ہوئی شیرنی کی طرح چٹکھٹا کر کہا اور فروٹ ٹرے سے چمکدار لوک والا چاقو اٹھا کر لہرایا۔

وہ وہیں رک گیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ اس طرح اس پر ہاتھ چھوڑ دے گی۔ وہ اسے عام لڑکیوں کی طرح سمجھا تھا جو کہ اس کی بے تحاشا دولت، ظاہری شخصیت و امارت سے مرعوب ہو کر اس کی ہوس کے جال میں پھنسنے کو دل و جان سے

تیار رہتی تھیں۔ لیکن یہاں تو معاملہ ہی الٹا نکلا تھا۔ شاید یہ لڑکی زبردست ایکسٹریس تھی۔ مگر وہ بھی کوئی عام معمولی شخص نہ تھا جو ڈر کر پیچھے ہٹ جاتا۔

”تم سمجھتی کیا ہو خود کو۔ کیا ہے تمہارے پاس؟ سوائے شکل و صورت کے جو ہر جگہ بہت مل جاتی ہیں۔ ایک سے بڑا کر ایک حسین و خوبصورت، مجھ جیسوں کے لئے مختصر، راہوں میں آنکھیں بچھائے، اپنا سب کچھ لٹانے کے لئے تیار ہیں۔ تم کیا چیز ہو؟“ وہ عقارت سے بولا تھا۔

”ہاں، ضرور ہوں گی۔ آپ جیسے جن کا نہ کوئی کردار ہوتا ہے نہ عزت و وقار۔ جو جانوروں کی طرح زندگی گزارنے پر غیرت سے مرنے کی بجائے فخر سے زندہ رہتے ہیں۔ جنہی اور بے مضیر لوگ۔“

”دیکھ لوں گا تمہیں نیک پروین۔“ وہ ڈھی ناگ کی طرح مل کھاتا ہوا پھونکا۔

”مجھے کزدرست سمجھئے۔ جب مجھے جیسی مجبور لڑکیاں گھروں سے قدم باہر نکالتی ہیں تو اپنی کمزوری و بے بسی پہلے ہی گھر کی دلہیز میں دفن کر دیتی ہیں۔“ وہ اس سے کسی طور متاثر نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ یعنی شانزل خان جس کی ایک نگاہ کے اشارے کی لڑکیاں ملنگھرتی تھیں آج ایک معمولی سی ورکر اسے دھتکار رہی تھی۔ اس کی حیثیت و انا پر کاری خرابیں لگا رہی تھی۔

”سوچ لو۔ اچھی آفر کو ٹھکرا کر برائے فیوچر کو بلیک کر رہی ہو۔“

”میرا فیملی انڈ کرے گا۔ آپ کو برائے اور بلیک ہونے کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”بہت اونچا اڑ رہی ہو اپنی پرواز سے زیادہ بلند۔ مگر..... ایک جھکے میں نیچے نہ لایا تو میرا نام بھی شانزل خان نہیں۔“ اپنے ہاتھ کی پشت پر دائیں ہاتھ سے ٹکا مار کر غرایا۔

”مجھے مظلوم تھا، بہت بلند آپ اپنی اوقات پر آجائیں گے۔ اور میں اسی وقت کا انتظار کر رہی تھی۔“ آئی انعام یوسٹر شانزل خان، میں ابھی اسی وقت آپ کی ملازمت پر

تھوک کر جا رہی ہوں۔ اور اگر آپ نے اب کوئی فضول دھمکی یا اصول بتانے کی کوشش کی تو میں مجبوراً پولیس میں رپورٹ کر دوں گی اور لوگوں کو بتا دوں گی کہ آپ کس طرح سے اپنی ورکرز کی عزتوں کا سودا کرتے ہیں۔" اُس نے ایک ایک لفظ ٹھہر ٹھہر کر ادا کیا اور ٹیبل سے اپنا بیگ اٹھا کر ہمیشہ کے لئے شانزل گروپ آف انڈسٹریز کو خیر باد کہہ آئی۔ لیکن اپنے پیچھے کھڑے شانزل خان کی زہر خند مسکراہٹ نہ دیکھ پائی تھی!

"کھوئے ہوئے سے رہنا دن کو، روتے پھرتا راتوں کو جو ہیں عاقل وہ کیا سمجھیں عشق و جنوں کی باتوں کو۔ وہ جو نہ آئے بادل چھانے، گرجے برے، کھل بھی گئے اس کے سوا ہم جہر کے مارے کیا جانیں برساتوں کو۔"

"اوہ شٹ۔ فضول بکواس کرنے سے بہتر ہے خاموش رہو۔" اُس نے گھور کر شہر پار کو دیکھا جو گھنٹوں سے اُسے ادھر ادھر مارٹ پاسٹ کرتے ہوئے دیکھ کر شعر ستا رہا تھا۔

"غصہ تھوک دواپ۔ کب تک اپنی ٹانگوں پر ظلم کرتے رہو گے؟"

"غصہ؟ میرا دل خود کو شوٹ کرنے کو چاہ رہا ہے۔ نہ معلوم میں کس طرح اور کیوں اس احمق سی لڑکی سے تھپڑ کھا گیا اور اُس کی فضول بکواس سن کر بھی اُسے جانے دیا۔"

"جب کوئی چپ کر دل میں بیٹھ جاتا ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ محبت کی ابتدا ایسے ہی ہوتی ہے میری جان۔ کل ہی تو میں نے ایک اسٹوری اس طرح کی پڑھی تھی۔ ہیرو بالکل تمہاری طرح ہوتا ہے پینڈسم، خوبرو اور دولت مند ماں باپ کی اکلوتی اولاد اور اس کا کریکٹر بھی بالکل تمہاری طرح ہوتا ہے۔ پلیز..... پلیز مائنڈ مت کرو۔ تو وہ لڑکا اپنی دیکھیں دنیا میں مست زندگی گزار رہا ہوتا ہے کہ اچانک اُس کی ملاقات تمہاری سیکرٹری جیسی لڑکی سے ہوتی ہے۔ ہیرو صاحب اسے بھی عام لڑکیوں کی طرح سمجھ کر غلط کرنا چاہتے ہیں لیکن وہ لڑکی شریف و باجیا ہوتی ہے۔ ایک دن ہیرو صاحب کی بڑھتی گستاخی اُسے یعنی ہیروئن صاحبہ کو مشتعل کر دیتی ہے اور وہ ہیرو کے منہ پر تھپڑ دے مارتی ہے۔ اس وقت ہیرو صاحب کو از حد غصہ آتا ہے لیکن وہ تمہاری طرح ضبط و برداشت سے کام

لیتا ہے۔ مگر جب رات کو تہائی میں سوچتا ہے تو اُسے محسوس ہوتا ہے، سراسر غلطی اسی کی ہے۔ اس کی چھوڑی حرکت پر نیک و معصوم لڑکی کا بیکہ رو گل ہونا چاہئے تھا۔ اور جناب! اس وقت ہیرو صاحب پر یہ معاملہ کھلتا ہے کہ وہ جس لڑکی سے بیزار و بے نیاز رہتے تھے، وہ تو نہ معلوم کب سے ان کے دل کے اندر قبضہ بنا کر بیٹھ گئی ہے۔ بیزار ہی، بے نیازی اور خند و راصل ان کی محبتوں کا ہی انداز تھا۔ پھر تو بڑی مشکل سے ہیرو صاحب رات گزارتے ہیں اور فجر کے وقت مسجد کے بجائے ہیروئن کے گھر جاتے ہیں اور اُس کے اباء اماں کی پرداہ کئے بغیر حالہ دل سنا ڈالتے ہیں۔ اور ہیروئن صاحبہ خود چپکے چپکے ان پر مرتی ہیں۔ وہ بھی شرما کر اعتراف کر لیتی ہے محبت کا۔ ہیروئن ہیرو کی شادی ہو جاتی ہے اور دونوں خوشی خوشی رہنے لگتے ہیں۔"

"لیڈر میگزین پڑھ کر تم ایسی ہی چپ اسٹوریز پسند کر سکتے ہو۔"

"خواتین کو سمجھنے کے لئے خواتین کے رسائل پڑھنا لازمی ہوتا ہے۔"

"فی الحال تم میرے رشتوں پر غمک مت چھڑکو۔ اگر میں تمہیں یہ بات بتا دیتا ہوں تو اس کا یہ مقصد نہیں کہ تم فضول میرا دل جلاؤ۔" وہ بیڈ پر بیٹھ کر جھجلا کر بولا۔

"میری بات مانو، رات بھر سوچو، ہو سکتا ہے صبح تمہیں بھی احساس....."

"دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ گیٹ لاسٹ۔ چلے جاؤ ورنہ میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔" اُس نے سخت اشتعال میں اُسے زبردستی کمرے سے نکال کر دروازہ اندر سے لاک کر لیا تھا۔

"ایڈیٹ، مان سنیں ہر بات مذاق سمجھتا ہے۔" اُس نے غصے سے کہا اور ایک بار پھر جھلنا شروع کر دیا۔ یہ عمل اُس کا رات سے جاری تھا۔ خفرائی حیات نے گویا اُسے عرش کی رفعتوں سے پاتال کی ذلت آمیز گہرائیوں میں لا پٹا تھا۔ وہ بے جان ڈیکوریشن ہیں سے جامعہ انجم تک خریدنے کا عادی تھا۔ بچپن سے اب تک ہر قسمی سے قیمتی شے اُس کے ایک اشارے پر حاضر کر دی جاتی تھی۔ پھر خفرائی حیات جیسی بے حد معمولی لڑکی کی یہ جرات کہ نہ صرف اُس کی پیشکش کو ٹھکرائے بلکہ اس کے چہرے پر نفرت و

اور تیزی سے زپ کھول کر بیک چنگ پر بھی دھانٹ چادر پر الٹ دیا۔ اور دوسرے لمحے اس کے منہ سے حیرت و خوف کی ٹی ٹلی جھج نکلی تھی۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھ بھئی بھئی نکاہوں سے چادر پر پڑی ٹائی پن اور رست وایج کو دیکھ رہی تھی جن میں جگمگاتے ڈائمنڈز کی قیمت کا اندازہ وہ لگا بھی نہیں سکتی تھی۔ بلاشبہ وہ گھڑی اور ٹائی پن شانزل خان کی ملکیت تھیں مگر اس کے بیک میں کس طرح آئیں؟ اس نے خود یہ چیزیں رکھی نہیں تھیں، خود سے وہ چیزیں بیک میں آئیں سکتی تھیں تو پھر..... شانزل خان خود..... اور اگر اس کی یہ چال ہے تو بڑی خوفناک ہے۔

گھبراہٹ و پریشانی کے باعث اس کے ہاتھ جھکے جان سے ہو گئے تھے۔ ابھی وہ ڈھنگ سے سوچ بھی نہ پائی تھی کہ دروازہ زور سے کھٹکھٹایا گیا تھا۔ اس نے گھڑی اور پن اٹھا کر بیک میں ہی ڈالے اور اسے محفوظ جگہ پر رکھ کر باہر مچن میں آگئی جہاں دروازہ تھا۔

”کون ہے؟“ اس نے حسب عادت دروازہ کھولنے سے پیشتر معلوم کیا۔
 ”میں ہوں ثانیہ۔“ دروازہ اس نے کھولا تو وہ بہت مگر بھوشی سے اس سے پٹ گئی۔
 ”کہاں گئی تھیں تم؟ چہرہ دن سے چھٹی پر ہو۔“ خضرتی نے اس کے برابر صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”تم ان دنوں بہت بڑی تھیں اس لئے بتانے کا موقع ہی نہ ملا۔ دراصل لاہور سے خالہ اور خالو آئے تھے، ساتھ خالو کے کچھ رشتے دار بھی تھے۔ ان کی مہمانداری کی خاطر چشیاں لیٹا پڑیں۔“

”بہا بھی گھر پر نہیں تھیں؟ کوئی اجنبی مہمانداری تھی کیا؟“ آخری بات اس نے کچھ شوشی سے کہی تھی۔ دل کے اندر تو اس کے پریشانی کا طوقان تباہی مچا رہا تھا مگر اپنی پریشانی وہ کسی باہر کے بندے سے شیئر کرنے کی عادی نہ تھی۔ جبر اس کو جھج کیا تھا۔

”میں نے تو بدخلوس میزبانی کی تھی۔ لیکن کہتے ہیں جو کام بے غرضی و خلوص سے کیا جائے، اس کا صلہ اللہ تعالیٰ دیتا ہے۔ میری مہماندان انہیں اس قدر بھائی کہ وہ فوراً

خدا کا نشان بھی ثبت کر دے۔

”نوٹ ایسا بلی خضرتی حیات اس ٹھیکر کی قیمت تمہیں اتنی مہنگی پڑے گی کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتیں۔“ اس نے وحشت جنوں میں نچل پر رکھی بوس منہ سے لگاتے ہوئے خوفناک انداز میں سوچا۔

”بلی! دروازہ بند کر لو۔ اور سنو، مجھے دیر ہو جائے گی مارکیٹ سے واپسی میں۔ پریشان مت ہونا۔ کبھی دروازے تک خوب چکر لگا کر ٹانگیں دکھاؤ۔ طبیعت پہلے ہی ٹھیک نہیں ہے۔“ انابی نے دروازے سے باہر جاتے جاتے بھی کوئی تیسری بار تاکید کی تو وہ اثبات میں سر ہلاتی دروازے کی اندر سے کھڑی لگا کر کمرے میں آ کر چنگ پر دروازہ ہو گئی۔ انابی کو اس نے کل کا واقعہ بالکل بھی نہیں بتایا تھا۔ آج طبیعت کا خرابی کا بہانہ کر کے گھر میں تھی اور جب تک دوسری ملازمت کا بندوبست نہیں ہوتا، تب تک کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے اسے گھر رہنا تھا۔ شانزل خان جیسے لوگ اپنی بد فطرتی، بد کرداری و عیاش طبع کو تسکین پہنچانے کے لئے حد سے گزر جاتے ہیں۔ اس قدر بچ اور اسنے کھٹیا کر کسی شریف کی چادر تار تار کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ سب کچھ بن مانگے مل جانے پر بچہ شکر ادا کرنے کی بجائے خود کو خدا سمجھتے تھے ہیں۔ زندگی گزارنے کے لئے ان جیسے بے ضمیروں کے پاس کچھ اصول، کچھ ضابطے ہوتے بھی ہیں یا نہیں، ریا و غرض سے بڑ باتیں، کھوکھلے قہقہے، ہوس زدہ محبتیں جنہیں رب نے ہر طرح سے مالا مال کیا، خوب نواز مگر جن کی خیریں سیر نہیں ہوتیں، خواہشوں کے بے لگام گھوڑے پر سوار جو آگے اور آگے کی سمت دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ جن کے لئے شرافت اور خیانت میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

ابھی نہ معلوم سوچوں کے جنگل میں کب تک بھٹکتی کہ معاً دروازے پر کسی سانک نے صدارت لگائی تھی۔ اس نے بیک سے پانچ کا نوٹ نکالا تو کوئی بڑ اس کے ہاتھ سے مگرانی تھی۔ اسے عجیب سی چیم کا احساس ہوا تھا۔ وہ تیزی سے فقیر کو پانچ روپے دے کر آئی

اپنے بیٹے کے نام کی انگوٹھی میری انگلی میں ڈال گئے اور اس ماہ کی سائیکس تاریخ شادی کی فکس کر گئے۔ بھابھی سیکے گئی ہوئی تھیں، اب آئی ہیں۔ خوب تیاریاں ہو رہی ہیں گھر میں۔“

”مبارک ہو، چٹ مٹنی ہٹ بیاہ۔ آج تو تینس تاریخ ہے۔ یعنی تمہاری شادی میں کل چار دن رہتے ہیں اور تم اب بتانے آئی ہو؟“

”پلیز، پلیز ناراض مت ہو۔ میں بتا رہی ہوں تاکہ سب بالکل اچانک ہوا ہے، کل وہ گئے ہیں، آج میں آگئی تمہارے پاس۔ یہ لو کارڈ۔ تمہیں اور انابی کو کل گھر آ جانا ہے اور وہاں سے واپسی میری ودار کے بعد ہوگی اور میں کوئی بات نہیں سنوں گی۔“ وہ دو ٹوک لہجے میں بولی۔

”انابی کو آنے دو مارکیٹ سے۔ پھر فیصلہ ہوگا۔“ وہ مسکرا کر بولی۔

”سب جانتی ہوں میں، نیلے اس گھر میں کس کے چلتے ہیں۔ تم کو ہر صورت کل سے آ جانا ہے۔“

”اوکے، پہلے بتاؤ چائے پیوگی یا شربت؟“ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

”پہلے شربت پھر چائے کے ساتھ تمہارے ہاتھ کے بنے ہوئے گرم گرم بکوزے۔“

پہلے یہ بتاؤ تم آج آفس کیوں نہیں گئیں؟“ وہ ایک دم چونک کر بولی۔

”سر میں درد تھا دات سے۔ اس لئے چھٹی کر لی۔ کیا تم آفس گئی تھیں؟“

”ہاں۔ ریزائن کر کے آرہی ہوں۔ میں اب لاہور چلی جاؤں گی۔“

”ایکسیپٹ کر لیا سر نے۔۔۔۔۔؟“ بگ میں چینی ڈالتے ہوئے اس کے ہاتھ ٹک گئے تھے۔

”ہاں اور مجھے شادی کی مبارکباد بھی دی ہے۔“

”یعنی ایسے کوئی اصول نہیں ہیں کہ ریزائن دینے سے تین ماہ قبل فرم کو انعام کرنا

ضروری ہے، اگر فوراً ریزائن دینا ہو تو جرمانے کے طور پر لکسی رقم کو دیں تو ریزائن

منظور ہوتا ہے، ورنہ نہیں۔“

”ارے تم سے یہ سب کس نے کہا؟ جس نے بھی کہا ہے، صرف مذاق کیا ہے۔“

چانیہ بے اختیار کھٹکھٹا کر فکس کر بولی تھی اور اس دن کی شانزل خان کی گفتگو اس کے

کاتوں میں گونجنے لگی تھی۔

”شانزل خان! تم بکے خبیث انسان ہو۔ بلکہ انسانیت پر بد نما دھند۔“ اس نے

نفرت سے سوچا۔

چانیہ چلی گئی تھی۔ انابی ابھی تک نہیں آئی تھیں۔ تنہائی پاتے ہی اس کے ذہن میں

پھر کھٹکی کچ گئی کہ وہ گھڑی اور ٹائی پن کس طرح واپس کرے؟ چانیہ سے ریزائن والی

بات سن کر اسے پکا یقین ہو گیا تھا کہ اس نے مکاری سے دونوں چیزیں نہ معلوم کس

لحے اس کے بیک میں ڈال دیں اور وہ محسوس بھی نہ کر پائی۔ اس کی اس طرح کی حرکت

یقیناً اسے چور ثابت کرنے کی ہوگی یا پھر کیا مقصد ہو سکتا ہے؟ دروازے پر دستک ہوئی

تو اس نے فوراً دروازہ کھول دیا کہ یقیناً انابی مارکیٹ سے واپس آئی ہوں گی۔ مگر

ماتھے شانزل خان کے ڈرائیور کو دیکھ کر اس کا چہرہ بگڑنے لگا۔

”سوری میڈم! سر نے کہا ہے آپ سے کوئی ضروری بات کرنی ہے۔ پلیز آپ بات

کر لیں۔ یہ فون نمبر ہے۔“ ڈرائیور اس کے خطرناک تیور بھانپ کر تیزی سے سوبائیں

اس کے ہاتھ میں دے کر دور چلا گیا۔

”جی۔۔۔۔۔ جی۔۔۔۔۔ اتنی چیپ حرکت! جی۔۔۔۔۔ اگر روپوں کی ضرورت تھی تو مجھ سے کہا

ہوتا، وہ گھڑی اور ٹائی پن تو بہت معمولی سی قیمت کے ہیں، زیادہ سے زیادہ چودہ پندرہ

لاکھ میں مل جائیں گے۔ بھلا اتنی معمولی سی رقم سے اس دور میں کیا ہوتا ہے ڈیڑا! مجھ سے

کہا ہوتا، میں کروڑوں میں قول دیتا اپنی جان کو۔۔۔۔۔“ اس کا لہجہ عامیانا اور ہیکا ہیکا تھا،

بھاری لہجہ خمار آلود ہو کر مزید بھاری ہو گیا تھا۔

”شٹ اپ۔ آپ کو یہ انتہائی گھٹیا حرکت بہت بھاری پڑے گی مسٹر شانزل خان۔“

”آہ۔۔۔۔۔ آج محسوس ہوا میرا نام کتنا خوبصورت ہے اور کسی کے حسین ہونٹوں سے

نکلنے کے بعد تو حریف حسین لگ رہا ہے۔“ دوسری طرف سے قہقہہ گونجا۔

”یہ چلے آپ اگر اپنی جیسی کسی تھرڈ کلاس گرل فرینڈ سے کہیں تو بہتر ہے۔ میرے بیک میں خاموشی سے گھڑی اور پن رکھ کر آپ کیا سمجھتے ہیں مجھے شکست دے دیں گے؟“

”شکست تو تمہیں ہو چکی ہے ڈیڑا مگر اپنا پسند اور ہٹ دھرم ہو، مانو گی نہیں۔ میں چاہتا ہوں۔“

”وہ دونوں چیزیں ڈرائیور کے ساتھ بھیج رہی ہوں۔ مہربانی فرما کر آئندہ مجھے کال کرنے کی زحمت مت کیجئے گا۔“

”نو..... نو..... لو ایسی لٹلٹی مت کرنا۔ اگر ڈرائیور کے ہاتھ رسٹ واپس اور عائی پن بھیجا تو انجام کی ذمہ داری آپ پر ہوگی۔“ رگویت بھرے لہجے میں دھمکی دی گئی۔

”واٹ پو مین؟“ وہ فیسے سے چبھتی تھی۔

”آئی مین، رسٹ واپس اور پن آپ خود لے کر آؤ۔ اور.....“

”میں قسم کھا چکی ہوں کہ اب کبھی آپ کی فرم میں قدم نہیں رکھوں گی۔ قسم ٹوٹنے سے بہتر میں جان دینا پسند کروں گی۔“ اس نے اس کی بات قطع کر کے سخت لہجے میں کہا۔

”مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے، تم فرم مت آؤ۔ میری بھی یہی خواہش ہے کہ تم سے اب ملاقات آفس سے باہر ہو۔ چلی آؤ، ڈرائیور تمہیں میرے پاس لے آئے گا۔ میں تمہیں خوش کر دوں گا۔ اتنی دولت دوں گا کہ.....“

”میں تمہیں ہوں تمہاری دولت پر کروڑ بار۔ سمجھے؟“

”ہم تو اس مقام پر آ گئے ہیں جہاں سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں مفلوج ہو جاتی ہیں۔ اب سوچنے اور سمجھنے کی باری تمہاری ہے۔ اگر کل تک تم میرے پاس وہ سامان لے کر نہیں آئیں تو کل شام تک میں تمہارے دروازے پر پولیس کے ہمراہ موجود ہوں گا

اور فقط تم پر رسٹ واپس اور عائی پن کی چوری کا الزام نہ ہوگا بلکہ سوچ لو، آفس کے سیف سے لمبی چوڑی رقم کی چوری بھی تمہارے نام لگ سکتی ہے اور تمہارے گھر سے برآمد بھی ہو سکتی ہے۔ میں کس خفیہ انداز میں کام کرتا ہوں یہ تو تم سمجھ ہی گئی ہوگی۔ سوچ لو، خوب

اچھی طرح سوچ لو۔ ساری رات تمہارے پاس ہے۔ کل شام ڈرائیور آئے گا۔ اگر عزت چاہتی ہو تو خاموشی سے چلی آنا اور نہ.....“ دوسری طرف سے دھمکی دے کر لائن آف کر دی گئی تھی۔

دل بڑی طرح دھڑک رہا تھا۔ جسم پر لرزہ طاری ہو گیا تھا۔ آخر کار وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ ڈرائیور باہر نہیں تھا، وہ اسے سو بائیں دے کر جا چکا تھا۔ وہ اپنی سوچوں میں اس قدر الجھ چکی تھی کہ انالی سے اتنی دیر سے آنے کا سبب بھی نہ پوچھ سکی۔ وہ بھی آتے ہی دھوکہ کر کے مغرب کی نماز پڑھنے لگی تھیں۔

ساری رات کی سوچ بچار کے بعد اس نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ کل ڈرائیور کے ساتھ وہ دونوں چیزیں دینے جائے گی۔ آگے کنواں، پیچھے کھائی والا حساب اس کے ساتھ تھا۔ اگر ڈرائیور کے ساتھ نہیں جاتی تو اس کا مضبوط لہجہ گواہی دے چکا تھا کہ جو اس نے کہا ہے وہ کر دکھائے گا۔ اور وہ یہ کب برداشت کرتی کہ گھر پر پولیس آ کر اسے چوری کے الزام میں گرفتار کر کے لے جائے اور اس کے ساتھ خاندانی عزت و وقار کا بھی جتنا زہ نگل جائے۔ جو اسے کسی طور بھی منظور نہیں تھا۔ بھلا اس کا کون یقین کرنا کہ وہ بے گناہ ہے۔

”انالی! چل رہی ہیں تانائے کے مایوں میں؟“

”بٹی! تم چلی جاؤ۔ میری طرف سے معذرت کر لینا۔ میں شادی والے روز آ جاؤں گی۔“

”آپ کو چھوڑ کر جانے کو دل نہیں مان رہا۔“ وہ ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر لاڈ بھرے لہجے میں بولی۔

”مجھے معلوم ہے بٹی۔ لیکن ثواب حاصل کرنا بھی سعادت ہے۔ تم میری طرف سے بے فکر رہو اور خوشیوں میں دل سے خوش ہونا۔ کتنا عرصہ ہو گیا ہے تمہیں مسکراتے دیکھے ہوئے۔“ وہ اس کی پیشانی چومتی ہوئی شفقت سے گویا ہوئیں۔ پڑوس میں رہنے والی

فاخرہ باجی کے آج کل میں پہلی ڈیوری ہونے والی تھی۔ دو سال قبل وہ بنگلہ دیش سے اپنے شوہر کے ساتھ یہاں آئی تھیں۔ یہاں ان دونوں میاں بیوی کا کوئی عزیز رشتہ دار

تھا۔ کسی روز اتانی سے ان کی ملاقات ہوئی۔ اتانی جیسی شخصیت پر خلوص حراج رکھنے والی سے جو ایک بار مل جائے وہ تاحیات ان کے خلوص اور مروت کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ پھر تو اتانی کو وہ میاں بیوی از حد چاہنے لگے ماں کی طرح۔ کل فائزہ بانجی کے میاں کام کی وجہ سے پنجاب گئے تھے ایک ہفتے کے لئے اور اتانی کو خیال رکھنے کا کہہ گئے تھے۔ جانیہ کی شادی کا کارڈ دیکھ کر انہوں نے کہا کہ وہ چل جائے، وہ فائزہ کے پاس رہیں گی کہ انہیں کسی بزرگ کی اشد ضرورت تھی۔

کشادہ شفاف سڑکوں پر کار بے آواز دوڑ رہی تھی۔ وہ بچھلی سیٹ پر کسی محنت کی طرح جی ہوئی تھی۔ تمام ہلچل، بے چینی، پریشانی و اضطراب سمندر کی ریت کی طرح تہہ در تہہ پیٹھ گئی تھی۔ ذہن اس وقت بالکل کسی سیپ کی مانند خالی تھا۔ پچھلے چوبیس گھنٹوں میں اس نے اس قدر سوچا تھا کہ اب کوئی سوچ باقی نہیں بچی تھی یا ذہن ہی منطوج ہو گیا تھا۔ ڈرائیور نے پورچ میں کار روکی تو اس نے سر اٹھا کر ہنرے کے درمیان بنے عالیشان جنگل کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ ڈرائیور کے ہمراہ چلتی کئی کوریڈورز، کمرے عبور کر کے وہ ایک بے حد ڈیکورینڈ کمرے میں آئی تھی۔

”یہاں بیٹھیں میڈم آپ۔“ مزاحمتی آتے ہیں۔“ ڈرائیور نے ویلٹ کے بیرون نگر صوفے کی طرف اشارہ کر کے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔ وہ خاموشی سے بیٹھ گئی۔ ڈرائیور چلا گیا تھا۔

قیمتی فرنیچر، بیش قیمت اور خوبصورت چیمینو سے مزین دہیز قالین اور خوبصورت قیمتی ویلٹ کے پردوں سے مسور کن خوشبوئیں بھوٹ رہی تھیں۔ ماحول خاصا خوباناک تھا۔ حالانکہ ابھی شام کے سائے ہر سو پھیلے ہوئے تھے مگر یہاں نصف رات گزر جانے کا گمان ہو رہا تھا۔ یکدم ہی اُس پر وحشت سی سوار ہونے لگی تھی۔ ہر طرف اتنی خاموشی تھی کہ اُسے اپنا دم گھٹنا ہوا محسوس ہونے لگا۔ گھبرا کر وہ کھڑکی کی سمت آئی۔ دھیرے سے تھوڑا سا پردہ ہٹایا تو کسی شخص کی پشت نظر آئی تھی۔ وہ کان سے موبائل لگائے کسی سے محو گفتگو تھا۔ اس نے غور سے دیکھا تو ہاتھ گاؤن میں لمبوں وہ کوئی اور نہیں شانزل خان ہی

تھا جس کی مسکراتی فریش آواز اتنی بلند تھی کہ اس کی سماعتوں میں با آسانی پہنچ رہی تھی۔ ”شٹ یا! ہم ڈال ڈال بیٹھنے والے تنہا ہیں۔ جہاں مطلب کا دانہ پانی ملا، طبیعت سیر کی اور دوسری جانب پرواز کی۔ یہ شادی تم جیسے اسٹوپڈ لوگ کرتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مرد کس طرح ایک ہی چہرے کے ساتھ ساری زندگی گزار لیتے ہیں۔ میری زندگی میں لڑکیاں بیوز پیچہ کی طرح آتی ہیں۔ جس طرح چند گھنٹے اسٹوڈی کے بعد ٹیڈ پیچہ بور اور ردی ہو جاتا ہے اسی طرح.....“ دوسری طرف سے نہ معلوم کیا کہا گیا تھا کہ وہ بیٹھنے لگا تھا۔

”بھئی یہ عشق و محبت کی باتیں ہم جیسے لوگ نہیں جانتے۔ ہم صرف خریدنا جانتے ہیں یا توڑنا، جو پسند آجائے اسے منہ مانگی قیمت دے کر خرید لیتے ہیں اور جو ناٹ فار سیل ہوتی ہے اسے ریزہ ریزہ کر ڈالتے ہیں۔“ اُس کے لہجے میں ایسی حقارت و حقیر تھی کہ خضریٰ کے دل میں شدت سے خواہش ابھری کہ اگر اس کے پاس ریوالور ہوتا تو ساری گولیاں اس کی پشت میں اتار دیتی۔ عورتوں کو کمتر اور بکاؤ مال سمجھنے کا حق اسے کس نے دیا تھا۔

”ڈیری ویری تھینکس، مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ عورتیں کتنی نیک، پارسا، باوقار اور ساتھ نبھانے والی ہوتی ہیں یہ مجھ سے بہتر کون جان سکتا ہے۔ بہر حال جب بھی پاکستان آؤ، میرے پاس ہی ٹھہرنا۔ میری آخر ہے۔ اؤکے..... مجھے اجازت دو، میری انٹیل گیٹ میرا لیوٹک روم میں انتظار کر رہی ہے..... ہا..... ہا..... جب سب کچھ آسانی سے مل رہا ہو تو پھر مجھے تمہاری طرح اسٹوپڈ بننے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔“ اُس نے بے ہاک تہقیر لگاتے ہوئے موبائل آف کیا تھا اور اسے نیمبل پر رکھ دیا تھا۔

خضریٰ نے جلدی سے پردہ چھوڑ دیا۔

”یا اللہ..... یا اللہ! آخر ہم جیسے لوگوں کو کیوں پیدا کرتا ہے جب ہمارے لئے کوئی جائے پناہ نہیں ہوتی تو۔“ شانزل خان کا ارادہ ایک دم ہی اس پر ظاہر ہوا تو وہ وحشت زدہ سی گیت کی سمت بھاگی تھی اور دوسرے لہجے زمین اُسے بیروں کے نیچے سے ٹھکسی

وہ بہکا بہکا لڑکھڑاتا ہوا اس سے کچھ قدم کے فاصلے پر بڑک گیا تھا۔
 خطرئی حیات اضطرابی طور پر کھڑی ہو گئی۔ اُس کے اعصاب یکدم ہی تناؤ کا شکار ہو
 گئے تھے۔ ایک تو اُس کا آؤٹ آف کنٹرول اندازہ متضاد بیہودہ لہجہ، اس کا سارا خون
 چہرے پر سمٹ آیا تھا۔

”مہشر شانزل خان! میں آپ کی ان ادبھی اور شرمناک حرکتوں کے پھندے میں
 نہیں چھٹنے والی۔ وہ آپ کی گھنیا چیزیں پڑی ہیں، انہیں سینے سے لگائیے۔ میں جاری
 ہوں۔“

”ایسی بھی کیا جلدی ہے؟ ابھی تو آپ آئی ہیں۔ کچھ ہمیں خاطر مدارات کا موقع تو
 دیں۔ کچھ اپنی کہیں، کچھ ہماری سنیں، کیا جلدی ہے؟“ وہ صوفے کی طرف اشارہ کرتا
 ہوا بولا۔

”تو جھٹکنس۔ میں جانا چاہتی ہوں۔“ وہ بدستور کھڑی تھی۔

”خطرئی حیات! کیوں وقت برباد کر رہی ہیں؟ میری آخر زڈ مل بھی ہو سکتی ہیں۔
 میں آپ کو دو سب کچھ دے سکتا ہوں جس کی چاہ ہر لڑکی کے دل میں ہوتی ہے۔ بلکہ
 آپ چاہیں تو میں فارن کنٹری میں پینشن کروا سکتا ہوں۔ آپ وہاں اپنی فیملی کے ساتھ
 پُر جھیش زندگی گزار سکتی ہیں۔ میری بات مان لیں، میں کچھ وقت گزارنا چاہتا ہوں آپ
 کے ساتھ۔“

”میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا شانزل صاحب! کہ میں تھرڈ ریٹ لڑکی نہیں
 ہوں اور میں اب بھی کہہ رہی ہوں، دنیا کی تمام دولت بھی مجھے نہیں خرید سکتی۔“ اُس کا

ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ وہ خمیخت ڈرا نیچر دروازہ باہر سے لاک کر گیا تھا۔

”جان سن!

جان تمنا!

جان بہاراں!

جان شانزل!

دیکھ مائی ہارٹ، دیکھ مائی ہارٹ، دیکھ مائی سویت ہارٹ!“

وہ غدار آلود لہجے میں بہکا بہکا اندر آ کر گنگٹایا.....!

三

”چہ..... چہ..... ڈونٹ ویپ۔ ہم بہت زیادہ گرے ہوئے اور بے حیثیت مسمیٰ مگر اب اتنے بھی گرے ہوئے نہیں کہ آپ کی حسین آنکھوں میں آنسو دیکھ سکیں۔“

”مگر آپ میں معمولی سی بھی حسیت ہے تو مجھے جانے دیں۔“

”آپ کو جانے سے کس نے روکا ہے؟ آپ جائیں گی۔ بلکہ ہم خود آپ کو عزت

کے ساتھ چھوڑ کر آئیں گے۔ لیکن..... پہلے یہاں جو آتش بھڑک رہی ہے اس کو ٹھنڈا کر لیں۔“ اس نے باتیں جانب سے پر ہاتھ رکھ کر دل کی طرف اشارہ کیا۔ پھر کہنے لگا۔

”معلوم ہے مرد کو یہ فطرت اور بے حیثیت کرنے والی کون ہوتی ہے؟ وہ عورت ہوتی

ہے جو کبھی تہبازی طرح پردے و پاک دامنی کا ڈھونگ رچا کر ہم جیسے مردوں کو راہ سے بھٹکاتی ہے تو کبھی نام نہاد پردے کی قید سے بھی آزاد ہوتی ہے۔ ”یکدم ہی وہ بھڑک اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کے لہجہ اور آنکھوں سے آگ برسنے لگی تھی۔ ایک عجیب رنگ اس کے چہرے پر چھا گیا تھا جس میں تکلیف و درد کی کیفیت نمایاں تھی۔“

”میری خواہش پوری کر دو۔ پھر خود چھوڑ آؤں گا۔“ وہ اس کی بات قطع کر کے بولا۔
 ”ہرگز نہیں۔ میں موت کو گلے لگا لوں گی مگر آپ کو ناپاک ارادوں میں کبھی
 کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔“ حضری اس پر وحشی پن سوار ہوتے دیکھ کر مضبوط لہجے
 میں کہہ اٹھی۔
 ”اپنی خواہش کی تکمیل سے قبل تو میں تمہیں مرنے بھی نہ دوں گا سویت ہارٹ۔“
 اس نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچا ہی تھا کہ فضا یکھٹ بے پناہ
 فائرنگ سے گونج اٹھی۔ بے اختیار شانزل نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ اسی دم زوردار

دھماکے کے ساتھ ہر طرف تاریکی پھیل گئی۔ فائرنگ کی آواز شدید ترین ہو گئی تھی۔ شاید اندر سے بھی جوابی فائرنگ شروع ہو چکی تھی۔ اس دوہری افتاد پر وہ بالکل ہی حواس باختہ ہو گئی۔ لارنٹ آف جوتے ہی کمرہ تاریک قہر جیسا ہو گیا تھا کہ ہاتھ کو ماتحتہ نہ بچاؤ دے۔

رہا تھا۔ شانزل خان تو فوراً ہی لاک کھول کر وہاں سے باہر نکل گیا تھا۔ وہ بھی گھبرا کر اندر سے کیٹ کی سمت بڑھی تھی۔ وہ قدم ہل کر ہی نہ معلوم کس شے سے ٹکرائی اور سیدھی منہ کے بل گر گئی۔ سر کی ٹوک وار چیز سے ٹکرایا تھا۔ چوٹ اتنی شدید تھی کہ لمبے بھر میں وہ ہوش و خرد سے بیگانہ ہو گئی۔

نہ معلوم کتنا وقت گزرا تھا، جب اس نے آنکھیں کھولیں تو پہلا احساس یہ جاگا کہ وہ لیٹی ہوئی ہے اور بیڈ مسلسل گردش میں ہے۔ یہ احساس عجیب سا تھا۔ وہ فوراً اٹھ کر بیٹھی تھی اور اس طرح بیٹھنے سے اس کے سر کے زخم میں ٹھیس اٹھنے لگی تھیں۔ لیکن اس نے اس کی پرواہ نہ کی۔ وہ جس صورت حال سے اس وقت دوچار تھی، اس نے اس کے رگ و پے میں سنسنی دوڑا دی تھی۔ وہ جسے بیڈ سمجھ رہی تھی، وہ بیڈ نہیں بلکہ کار کی پچھلی سیٹ تھی۔ کار مسلسل گھوم رہی تھی۔ فرنٹ سیٹ پر شانزل خان کان سے موبائل لگائے کسی سے گفتگو کر رہا تھا۔ اُسے اٹھتے دیکھ کر موبائل اس نے آف کر دیا تھا اور اس کی طرف جھک کر خاصی اپنائیت سے گویا ہوا۔

”پلیز..... آپ لیٹی رہیں۔ سر میں آپ کے خاصی چوٹ آئی ہے۔“

”نہ..... یہ آپ کہاں لے کر جا رہے ہیں مجھے؟ کیا..... کیا مقصد ہے؟“ بے شک وہ بائیس سالہ زندگی میں کراچی سے باہر کبھی نہیں گئی تھی لیکن اتنا فہم و ادراک رکھتی تھی کہ ہر صوبے کی ثقافت و علاقائی جغرافیہ سے واقف تھی۔ شیشوں سے باہر نظر آنے والے وہ گرم دیکھتے سورج سے روشن ہوتے مناظر صوبہ سندھ کے لگ رہے تھے۔ یعنی وہ کراچی کی حدود سے باہر آچکے تھے۔ اب نہ معلوم کس طرف جانے کا اس کا ارادہ تھا۔

”شہر کے بنگاموں سے دور پڑ سکون جگہ چل رہے ہیں ہم۔“ اس کا بڑ سکون لہجہ قابل دید تھا۔ کار میں فل اے سی کوئنگ کے باوجود اس کی رگ رگ میں انگارے دیکھنے لگے۔ سرتاپا وہ پسینے میں شرابور ہو گئی۔ یہ احساس ہی دشتوں میں بھونکنے کے لئے کافی تھا کہ وہ اسے اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ اس کی اجازت اور مرضی جیسے کوئی حیثیت ہی نہ رکھتی تھی۔

”سوچوں کے جنگلوں میں زیادہ دیر نہیں بھٹکتا چاہئے، اس طرح منزل میں گم ہو جاتی ہیں اور راستے کھو جاتے ہیں۔ بھوک لگ رہی ہوگی آپ کو؟ کچھ دیر رُک جائیں۔“ اسے خوفزدہ و متوحش اور گم سم دیکھ کر اس نے مہربان لہجے میں تسلی دی۔ گویا اس کے لئے یہ کوئی پریشان کن بات نہیں تھی۔

”آخر یہ سب کیا ہے؟ آپ مجھے کہاں لے جا رہے ہیں؟ وہ بھی میری اجازت کے بغیر۔“

”آپ کے سوال کا جواب دے چکا ہوں۔ اور دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ میں آپ کی مرضی کے بغیر آپ کو لے آیا ہوں تو واقعی میں اس جسارت پر معذرت خواہ ہوں۔ دراصل میں بقول آپ کے بہت گرا ہوا شخص ہوں، مگر اتنا گھٹیا اور بے حیت نہیں کہ اپنے دشمنوں کے درمیان آپ کو چھوڑ آتا۔ آپ جلد ہوش میں نہ آنے کی قسم کھا کر شاید بے ہوش ہوئی تھیں کہ کوششوں کے باوجود جب ہوش میں نہیں آئیں تو مجھے مجبوراً اپنے ساتھ لانا پڑا۔ اللہ گواہ ہے، یہاں میری نیت میں کھوٹ نہیں تھا۔“ وہ اسی طرح اس کے طرف رخ کئے کچھ گفتگو کرتا تھا۔

”جھوٹ بول رہے ہیں۔“ وہ چیخ کر بولی۔

”نہیں۔ ہم تو بہت گناہ گار بندے ہیں۔ غنائی مسلمان۔ لیکن آپ تو بچی مسلمان ہیں۔ پانچویں وقت اللہ کو سجدہ کرتی ہیں۔ پھر اتنی صلاحیت تو آپ میں ہوگی کہ جھوٹ اور سچ میں تمیز کر سکیں کہ اللہ کو گواہ بنا کر جھوٹ تو نہیں بولا جاسکتا۔“

”اگر یہ سچ ہے تو آپ مجھے یہیں اتار دیں۔ میں گھر چلی جاؤں گی۔ آپ کے دشمنوں سے میرا کوئی تعلق نہیں۔“

”اب یہ ممکن نہیں ہے۔ ہم کراچی کی حدود چھوڑ کر سندھ کی آخری حدود میں داخل ہو چکے ہیں اور ہمارا یہ سفر کئی گھنٹوں پر مشتمل ہے۔ آپ کو بے ہوشی کے دوران محسوس نہیں ہوا۔“

”آف! لیکن مجھے یہاں نہیں رہنا۔ میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔“ اس نے

بھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

اس لمبے شانزل خان نے کچھ برہمی کی نگاہ سے اُسے دیکھا پھر سرد لہجے میں کہنے لگا۔ ”بیوقوفی کی باتیں مت کرو، جو میں نے کہا ہے اسے سمجھنے کی کوشش کرو۔“

”بیوقوفی کی بات آپ کر رہے ہیں یا میں؟ میری اس طرح گھر سے غیر حاضری میرے لئے کیا مشکلات کھڑی کر سکتی ہے، کس طرح سے دوسوایاں میرا آٹھل داغدار کر سکتی ہیں، آپ کو اس سے کوئی سروکار نہ ہوگا۔ بلکہ آپ کی پلاننگ میں تو یہ شامل ہے۔“

”اوہ شٹ! بدگمانی کی بھی کوئی انتہا ہوتی ہے۔ لیکن تم ہر انتہا عبور کر چکی ہو۔ تم سے کچھ کہنا یا سمجھانا پتھر سے سر پھوڑنے کے مترادف ہے۔ لہذا خاموش رہو تو بہتر ہے۔“

اس نے سختی سے کہتے ہوئے ٹوٹ پھیر لیا تھا۔

”مجھے آپ سینیں اتار دیں ورنہ میں چلتی گاڑی سے چھلانگ لگا دوں گی۔“ اس بار اس کے لہجے میں وحشت جھلک چکی تھی اس انتہا کو تھا کہ چند ساعت شانزل خان نے اس کی طرف گھور کر دیکھا پھر ڈرائیور کو کار روکنے کا کہا۔ کار روکتے ہی وہ برقی رفتار سے فرنیٹ ڈور سے اتر کر بیک ڈور کھول کر اس کے برابر بیٹھ گیا اور ڈرائیور نے کار دو بارہ ڈرائیور کرہ شروع کر دی۔ اُس کی برقی رفتار پر وہ بھونچکا رہ گیا۔

”تم حد درجہ بددعا ہی نہیں بلکہ احمق بھی ہو۔“ اس کے برابر میں بیٹھ کر وہ غرایا تھا۔ خضریٰ حیات اس کے اس طرح بیٹھنے سے غیر ارادی طور پر دوڑ کھٹک گئی تھی۔

”دور کیوں جاتی ہو، تم بھی تو یہ بتی تھیں کہ میں قریب۔ قریب۔ بھٹوں تو پھر یہ اعتراض کیوں؟“ اس نے ہاتھ بڑھا کر اُسے خود سے قریب کر لیا۔

”چھوڑ نہیں مجھے۔ چھوڑو، چھوڑو مجھے۔“ اس کے بازو کے گھیرے میں وہ تڑپ کے رہ گئی۔ اس کے مضبوط بازو کی گرفت بھی کچھ ایسی ہی تھی جیسے فولادی کھنجر۔

”بہت دیکھے ہیں ایسے ننگ۔ بس ختم کرو نا اب۔ بہت ہو چکا۔“ اس نے جھک کر سرکشی کی۔ خضریٰ کے چہرے کو اس کی سانسیں جھلسائے لگیں۔ اس کے ٹیڑھ سے چھٹی ٹھون کی جھک سر پکڑانے لگی۔

وہ اتنا غرور اور بے باک تھا کہ کار میں موجود ڈرائیور کی رتی بھر بھی پرواہ نہ کرتی اسے۔

”شرافت سے بیٹھ جاؤ۔ اس وقت میں ڈسٹرب ہوں۔ کوئی حماقت برداشت نہیں کروں گا۔“ ایک جھٹکے سے شانزل خان اس سے الگ ہو بیٹھا تھا اور ساتھ ہی سخت لہجے میں تنبیہ بھی کی تھی۔

باقی رات سکون سے ملے ہوا۔ خضریٰ نے اس کی بے باک فطرت سے خائف ہو کر مزید کسی مزاحمت کا ارادہ ترک کر دیا اور خاموشی سے دل ہی دل میں فرار کے منصوبے بنانے لگی۔ وہ بھی اسے خاموش دُور سکون دیکھ کر اطمینان سے بیٹھ گیا تھا۔

شام ڈھلے کار کے کچے راستوں سے گزر کر سرخ اینٹوں سے بنی وسیع و عریض حویلی کے گیٹ پر ٹوکی تھی۔ گیٹ سے باہر ہی کافی لوگ ان کے استقبال کو موجود تھے۔ سفید براق سونوں میں ملبوس رنگ برنگی اجڑک لپٹے، رنگین کڑھائی والی شیشوں کی ٹوپیاں اوڑھے، لمبے چوڑے لوگ جن کے بھاری بھر کم چیزوں پر دور سے ہی نظر آتی سیاہ اور بے ہنگم موٹھیں خوفناک لگ رہی تھیں۔ اُس کے دل میں کسی نئے خوف نے جھک بٹائی۔

کار روکتے ہی دو سب تیزی سے آگے بڑھے تھے۔ شانزل خان بڑی گرم جوشی سے ان سے گلے ل رہا تھا۔ ڈرائیور ایک جانب مودبانہ انداز میں کھڑا تھا۔ ان لمحات میں وہ جیسے منظر سے ادھم بھونچ گیا تھا۔ پھر شانزل کو بھی اس کا خیال آیا تھا۔ اس نے قریب کھڑے ڈرائیور کو کچھ حکم دیا تھا۔ چند لمبے بعد وہ اس کی عمر ایسی حویلی کے اندر داخل ہو گئی تھی۔

”کیا بات ہے بابا! کچھ اُکھے اُکھے پریشان سے دکھائی دے رہے ہو۔ خیر تو ہے نا سائیں؟“ رات کو کھانے سے فراغت کے بعد وجاہت علی سومرو جو اس علاقے کا دیرینہ اور اس کا خاص دوست تھا، چٹائی پر لٹے ہی میٹیس انداز میں استفسار کرنے لگا۔

”نہیں۔ زیادہ پریشانی کی بات نہیں ہے۔“

”سائیں! زیادہ اور کم کیا، پریشانی تو پریشانی ہوتی ہے اور ہمارے پارٹنری ہمارے

زبردہ رہتے ہوئے پریشان ہوں یہ ہمارے لئے ڈوب مرنے کا مقام ہے۔“ دجاہت سمرود نے اپنی موٹی موٹی سونچوں کو تادیتے ہوئے ناراض لہجے میں کہا۔

”تم بے فکر ہو یا رہیں ایسے پر اہلو خود پینڈل کرتا رہتا ہوں۔“

”پھر بھی کچھ معلوم تو ہو، کیا معاملہ ہے؟ تم اس طرح میرے غریب خانے پر آنے والے تو نہ تھے۔“

”خرم انڈسٹریز کے نام سے تو واقف ہو گئے نا۔ پچھلے سال سے ڈیڈ کا اس سے معاملہ چل رہا ہے۔ اس کی ہر ممکن کوشش ہوتی ہے کہ برنس ورلڈ میں شانزل انڈسٹریز کی ویلیو مزید بیل پر آ جائے۔ اپنے سب ہتکنڈوں میں ناکام ہونے کے بعد وہ لوگ اب میرے جانی دشمن بنے ہوئے ہیں۔ کل رات بھی اچانک ان لوگوں نے بچکے پر ایک کر دیا تھا۔ ڈیڈ کی ہدایت کے مطابق مجھے ابھی چند دن اس شہر سے دور رہنا ہے سو میں تمہارے پاس چلا آیا اور کل آگے جانے کا پروگرام ہے۔“ شانزل نے اُسے تسلیاً حالات سے آگاہ کیا۔

”پہلے کیوں نہیں آگاہ کیا ان حالات سے؟ دجاہت سمرود کے دوست کا دشمن اس کا دشمن ہوتا ہے۔ بے فکر رہو، کل ہی تمہارے دشمن صفحہ ہستی سے مٹ چکے ہوں گے۔ میرے بندے۔۔۔“

”نہیں پلیز، تم بھی وہی کام کرنے جا رہے ہو جو ڈیڈ کرنا چاہتے تھے۔“ اُس نے دجاہت سمرود کی بات کاٹ کر سرد لہجے میں کہا۔

”کیا تم اپنے دشمنوں کو ایسے ہی چھوڑ دینا چاہتے ہو؟“

”کم ظرف اور بزدل لوگوں کی پر چھائیوں سے بھی مجھے نفرت ہے۔ بہادر وہی ہوتے ہیں جو سامنے آکر وار کرتے ہیں اور مقابلے کی ہمت رکھتے ہیں۔ بزدل لوگوں سے میں دشمنی یا دوستی کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ اگر یہی سب کرنا ہوتا تو میرے پاس بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو اشارہ پاتے ہی جان لینے اور دینے کی ہمت و حوصلہ رکھتے ہیں۔“

”تم ابھی تک ایسے ہی ہو، درگزر سے کام لینے والے۔ ٹھیک ہے بابا ٹھیک ہے۔ یہ بتاؤ، رات کا کیا پروگرام ہے۔ کسی ”ایجنٹ گیسٹ“ کا انتظام کریں یا۔۔۔۔۔“ دجاہت سمرود نے باتیں آنکھ دہاتے ہوئے مخصوص لہجے میں بات اور حوری چھوڑ دی۔

”فی الحال کسی گیسٹ کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ریٹ کرنا چاہتا ہوں۔“

”ہا۔۔۔۔۔ ہا۔۔۔۔۔ تمہاری ٹھکن اتارنے کا سامان تیار کیا ہوا ہے میری جان! ڈیرے پر چلو، رنک و سرور کی محفل بھی ہوئی ہے۔ تم کتنی قیامتیں بکھڑ ہیں ہماری۔“

”سرکار! وہ مہمان بہت فتنے میں ہیں اور کچھ کھاپی نہیں رہی ہیں۔“ اسی دم ایک ملازم نے آکر اطلاع دی۔

”اچھا تم جاؤ۔“ دجاہت علی سمرود نے شانزل خان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ملازم کے جانے کے بعد معنی خیز لہجے میں بولا۔

”کیا چکر ہے؟ تم عورتوں کے خڑے کب سے برداشت کرنے لگے؟“

”اس بار خاصی چکر باز لڑکی نکرائی ہے۔ اپنی دے، وقت کے ساتھ ساتھ وہ بھی اپنے خول سے نکل آئے گی۔“ جواباً اُس نے بھی معنی خیزی سے کہا تھا۔

”ہاں سائیں! بعض لڑکیوں کی عادت ہوتی ہے فضول خڑے دکھانے کی۔ مگر زیادہ لٹ نہ ملے تو اپنی اوقات پر جلد ہی آ جاتی ہیں۔“ نہ معلوم کس جذبے کے تحت شانزل نے اسے ناگواری سے گھورا تھا۔ وہ گزیرا سا گیا۔

”پھر تھل رہے ہو نا ڈیرے پر؟“

”نہیں، تم جاؤ۔ یہ میرے عہد کا معاملہ ہے۔ جب تک میں اس بد و ماغ اور گھمنڈی لڑکی کا غرور پاش پاش نہیں کر دیتا تب تک ہر رنگینی سے دور رہنے کا عہد کر چکا ہوں۔“

”پھر تو وہ کوئی عام لڑکی نہیں ہو سکتی جس نے شانزل خان آنریڈی کو صرف اپنا پابند کر لیا۔ یقیناً وہ ایک عالم کو فتح کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔“

”بی بی جی اللہ کے واسطے زیادہ نہیں تو تھوڑا ہی کھا لیجئے۔ کل سے آپ نے کچھ نہیں

کہا۔ اس طرح آپ کی طبیعت خراب ہو سکتی ہے۔“ ڈرائیور نے نہایت عاجزی سے دسویں بار اس سے درخواست کی جو کمرے میں از حد خراب موڈ لئے بیٹھی تھی۔

”جسٹ میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے کھٹیا انسان۔ آج تمہاری وجہ سے ہی میں یہ منحوس گھڑی دیکھنے پر مجبور ہوں۔ نہ تم دروازہ باہر سے لاک کر کے جاتے اور نہ میں اس طرح در بدر ہوتی۔ اپنے مالک کے ساتھ گناہ میں تم بھی برابر کے حصے دار ہو۔“ اُس کے لہجے میں زہری زہر تھا۔

”دروازہ باہر سے لاک نہیں تھا بلکہ وہ اندر سے بند کر دینے سے کل جاتا ہے۔ ہم تو حکم کے غلام ہیں، جو مالک حکم دیں اسے بجالاتا ہی ہمارا فرض ہے۔“

”ایسی دلائی کی روٹی کھانے سے بہتر ہے تم اپنے بیوی بچوں کو زبردستی کر مار دو۔ تم کیسے مسلمان ہو؟ تمہارا ضمیر کبھی ملازمت نہیں کرتا اس گھٹیا نوکری پر؟“

”نور محمد!“

”جی صاحب۔“ ڈرائیور شانزل خان کی آواز سن کر بوکھلا کر سڑا۔ وہ نہ معلوم کب وہاں آکھڑا ہوا تھا۔ ان دونوں کی اس طرف پشت تھی۔

”جاک۔“ اُس کا لہجہ بے تاثر اور سپاٹ تھا۔

”کہانا کیوں نہیں کھا رہی ہیں آپ؟“ ڈرائیور کے جانے کے بعد وہ اس کے قریب چلا آیا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسی طرح اکھڑی اکھڑی کھڑی رہی۔

”میں آپ سے مخاطب ہوں۔“

”مرضی میری۔“ اُس کے ہر انداز میں جھٹ دھری اور حقارت تھی۔ شانزل خان کا دماغ ایک دم ہی آلت گیا۔ وہ کب ایسے لہجے سننے کا عادی تھا اور نہ ایسے تہور دکھانے کی کوئی اسے خواب میں بھی جرأت کر سکتا تھا۔ پھر یہ بے حیثیت، کمزور سی لڑکی بار بار اس کی عزت نفس پر، اس کے چہرہ پر ضربیں لگا رہی تھی۔ آخر برداشت کی بھی کوئی انتہا تھی۔ وہ کبھی کسی کا رعب برداشت کرنے کا عادی ہرگز نہ تھا۔

”کیا کہا؟ پھر سے کہو۔“ اُس کے لہجے میں غراہٹ تھی۔ شدید ترین۔

”شانزل خان آفریدی! میں نے کہا، مجھے بھوک نہیں ہے اور میری مرضی۔ مجھے اختیار ہے کہ میں جو اپنے لئے بہتر سمجھوں وہی کروں۔“ وہ اس سے ذرا بھی مرعوب نہیں ہوئی تھی۔

”نہیں، اس وقت تم میرے اختیار میں ہو اور مرضی صرف میری چلے گی، سمجھیں؟“ اُس نے خنکری کا بازو پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔

”ہرگز نہیں۔ تم مجھے یہاں اپنی مرضی سے لے آئے ضرور ہو، مگر اب تمہارے اختیارات کی حدود ختم ہو چکی ہیں۔“

”اختیارات!“ اُس نے زہریلا قہقہہ لگایا۔ پھر اس کے شانوں پر دونوں ہاتھوں کا دباؤ دیتا ہوا بولا۔ ”جہاں سے میرے اختیارات کی حدود شروع ہوتی ہیں وہاں ”اخلاقیات“ کی حدود ختم ہو جاتی ہیں۔“ اُس نے بے باک نگاہوں سے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری نام نہاد پاک بازی کی جاکے لئے لازمی ہے کہ مجھے جیتنے کے دھڑکنے پر مجبور مت کرو۔ یہ تو تمہیں معلوم ہی ہو گا کہ مرد جب وحشی بنتا ہے تو ساری قسموں، سارے وعدوں سے نا بلند و بے بہرہ ہو جاتا ہے۔“ خنکری کو لمحے بھر میں احساس دلا دیا کہ وہ ایک کمزور و ناتواں لڑکی ہے جو زبان کی کاٹ سے تو اس مرد کو زیر کر سکتی ہے مگر جسمانی لحاظ سے وہ ایک چوڑی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس جیسے بھرپور طاقت رکھنے والے شخص کے بازو بھی اپنے شانوں سے ہٹانے کی طاقت اس میں نہ تھی۔

”اُنبہ۔۔۔۔۔ مجھے گائیڈ کرنے کی کوشش مت کرنا۔“ اُس نے دھکا دے کر اسے راستے سے ہٹایا تو وہ صوفے پر جا گری۔

”کہانا کھا لو۔۔۔۔۔ یا میرے ہاتھ سے کھانا پسند کرو گی؟“ اُس کے اشتعال بھرے انداز میں یکگفت شوخی ابھرتی تھی۔ اُس کے مزاج میں حد درجہ حاکمیت تھی۔ ایسے شاہانہ مزاج کے لوگ کسی دوسرے کو برداشت کرنے کا ظرف قطعی نہیں رکھتے۔ وہ چھوٹی عمر سے صرف ہاں سنتا آیا تھا۔ کسی کی جرأت نہ تھی کہ کچھ کہہ سکے۔

پہلی بار خیر کی حیات نے اسے انکار کی اذیت سے روشناس کر لیا تو وہ اسے اپنے لئے چیلنج سمجھ بیٹھا۔ اس وقت اس کے خود پسند جذبے کو بہت تقویت و طمانیت کا احساس ہوا جب وہ فخر و افتخار سے چلنے والی لڑکی اس کی معمولی سی قربت سے ہم کر کا پٹھی تھی۔ اس کے چہرے کے اڑتے رنگ کو دیکھ کر اس کی مردانگی کا سینہ فخر و غرور سے بلند تر ہو گیا۔ انا و انتہا پسندی باغ باغ ہو گئی تھی۔

”کیا ارادہ ہے؟ کھانا ہے میرے ہاتھ سے؟“ اس کی خاموشی محسوس کر کے وہ دوبارہ شوخ ہوا۔

”پلیز، مجھے تنہا چھوڑ دیں۔ میں تنہائی چاہتی ہوں۔“ اپنی ذات کی کمزوری کا احساس، لہجے کا کھوکھلا پن خود اسے صدمے سے بڑھ حال کر گیا۔

”اوکے۔ فائنٹ کھانا کھاؤ۔ کچھ دیر بعد نور محمد کو بھیج رہا ہوں برتن لینے کے لئے۔ اگر کسی چیز کی خواہش ہو تو کہو۔“ وہ دروازے کے قریب تک کر گیا ہوا۔

”نی الوقت تنہائی، صرف تنہائی۔“

لحہ بھر وہ اسے بغور دیکھتا رہا پھر گڈ ٹائٹ کہتا ہوا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ اس نے اندر سے کنڈی لگائی اور چھوٹی میز پر رکھے کھانے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ از حد پریشانی و تنکرات کے باعث زیادہ نہیں کھایا گیا۔ پانی پی کر وہ بیڈ پر آ کر لیٹ گئی۔ سر کا زخم درد کرنے لگا تھا۔ کچھ دیر وہ سر پر ہاتھ رکھ کر لیٹی رہی پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اضطراب زیادہ ہی بڑھا تو اٹھ کر بیٹھنے لگی۔ اسے یہاں سے فرار ہونا تھا اور یہ کام رات کی تاریکی میں ہی درست طریقے سے ہو سکتا تھا۔ شانزل کی نگاہوں میں ہوس کا رقص وہ دیکھ چکی تھی۔ وہ شخص کبھی بھی انسانیت و اخلاقیات کے لیادے سے آزاد ہو سکتا تھا اور وہ یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اس کی ہوس سے داغدار ہونے سے بہتر موت کو گلے لگا لینا ہے۔

جس وقت نور محمد کھانے کے برتن لینے آیا، اس نے پلان کے مطابق بھر پور خیر سے جاننے کی اداکاری کی۔

”کیا بات ہے؟“ اس نے دروازہ کھول کر جانی لینے ہوئے اسے ڈانٹا۔

”ووہووہ..... کھانے کے برتن لینے تھے۔“ نور محمد اس سے از حد خوفزدہ رہتا تھا۔

”مجھ نہیں لینے آ سکتے تھے؟ سخت نیند سے جگا دیا۔ لے جاؤ برتن۔“

صاحب نے یہ دودھ اور ٹیبلٹ دی ہیں۔ انہیں بھی کھالیں۔“ وہ دودھ سے بھرا جگ اور ٹیبلٹ تپائی پر رکھ کر آہستگی سے بولا اور کھانے کے برتن اٹھا کر تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔ اس نے ٹیبلٹ پانی سے کھائیں اور کچھ دیر بعد لیٹ گئی۔

رات کی سیاہی پوری طرح کائنات کو اپنی پیٹ میں لے چکی تھی۔ تاریکی میں اپنی ہر چیز خوفناک اور پراسرار لگ رہی تھی۔ وہ دیے و دیے قدموں سے نہایت احتیاط سے آگے بڑھ رہی تھی۔ باہر نکلنے سے قبل اس نے اچھی طرح جائزہ لیا تھا۔ یہ حویلی گیسٹ ہاؤس کے طور پر استعمال ہوتی تھی یا دوسرے محسوس میں ان کی عیاشیوں کا اڈہ تھی۔ وہاں کوئی عورت نہیں تھی۔ صرف چند ملازم تھے۔ کمرے بھی زیادہ تر لاکڈ تھے۔

ہر سو اندھیرا تھا۔ صرف راہداری میں ایک ٹائٹ بلب کی زرد روشنی ماحول کو مزید خاموشی اور وحشت ناک بنا رہی تھی۔ گیٹ کے پاس چوکیدار چارپائی پر لیٹا بے فکری سے خراٹے لے رہا تھا۔ وہ چند لمحے کھڑی چوکیدار کو بغور دیکھتی رہی کہ اس کی نیند کبھی تو نہیں۔ جب اطمینان ہو گیا کہ وہ کبھی نیند سو رہا ہے تو ہاتھ بڑھا کر نیکے کے نیچے رکھی چابیوں کے گچھے کو اٹھا تا ہی چاہتی تھی کہ معا ایسا محسوس ہوا جیسے اندر سے کوئی آ رہا ہو۔ وہ فوراً درخت کی آڑ میں ہو گئی اور وہاں اندھیرے میں چپکتے ختمے سے جتنو کو دیکھ کر اس کا دل دھک سے دو گیا۔ وہ ایک مخصوص زاویے سے اٹھتی گرتی سگریٹ کا شعلہ تھا جو اندھیرے میں جتنو کی مانند چمک رہا تھا۔ بغور دیکھنے پر وہ شخص بھی نہایت اطمینان سے کھڑا دین نظر آ گیا۔ گویا اسے یقین تھا کہ وہ یہاں ضرور آئے گی۔ سوانح نگار کی گھڑیاں گمن رہا تھا۔

”ہیلو، مجھے معلوم تھا تم یہ احتجاج حرکت ضرور کر دو گی۔“ وہ قریب آ کر گویا ہوا۔

”آپ کو اپنے علاوہ سب احسن اور بے وقوف نظر آتے ہیں۔“ اپنی شدید ناکامی پر زبان پر قفل ڈالنا اس کے لئے ناممکن تھا۔ چنانچہ جھنجھلا کر طعنیہ لہجے میں بولی۔

”نہیں۔ جوہوتے ہیں صرف وہ۔“ وہ بھی دل جلانے والی باتیں مزے سے کرتا تھا۔
”اؤنہہ.....“

”یہ اؤنہہ اور اوں ہوں سے کام نہیں چلے گا۔ چلے اندر انتہائی فیصلے کرنے سے قبل
تھوڑا عقل کو بھی زیرِ استعمال لے آیا کریں جو نہ معلوم کب سے رنگ آلود ہو رہی ہے۔“
وہ اسے بازو سے پکڑ کر کھینچتا ہوا کمرے میں لے آیا تھا۔

”تمہارے عزائم تو میں اسی وقت بھانپ گیا تھا جب تم کھانے سے انکار کر رہی
تھیں۔ نور محمد نے بتایا کہ تم نارمل ہو گئی ہو بلکہ گہری نیند سے بیدار ہوئی تھیں تو میرے
شک کو مزید تقویت ملی۔ سوچنے کی بات ہے، ایک لڑکی جو اپنی مرضی کے بغیر لائی گئی ہو،
جو کئی گھنٹے بھوکے ہونے کے باوجود کھانے کو اہمیت نہ دے رہی ہو بھلا ایسی حساس و
ضدی لڑکی درپیش آنے والے اندیشوں سے بے فکر ہو کر کیسے سو سکتی ہے۔ تو..... تو.....
امپائل۔ نور محمد جیسا محمد و سوچ اور ذہنیت رکھنے والا بندہ اس فریب کے جال میں پھنس
سکتا ہے مگر شانزل خان جو ایک دنیا کو فریب دے سکتا ہے اسے فریب دینا قطعی ناممکن
ہے۔“ اُس نے فخریہ لہجہ میں کہا۔

وہ کچھ نہیں بولی۔ کرسی پر بیٹھی دانتوں سے ہونٹ کاٹتی رہی۔ اس وقت غم و غصے سے
اس کی بری حالت تھی۔ منزل کے قریب پہنچ کر تاکام ہو جانا اذیت ناک ترین عمل تھا۔

”بائی دادو، اس وقت آپ کہاں جانے کا ارادہ رکھتی تھیں؟“

”کہیں بھی۔ لیکن اس جہنم سے ہزاروں میل دور۔“

”گویا باہر تو جنت کے باقی ہاتھوں میں پھول لئے آپ کی آمد کے منتظر ہوتے۔“
اُس کا لہجہ سو فیصد چڑانے والا تھا اور وہ بری طرح چڑی گئی تھی۔

”بے شک۔ آپ کے مقابلے میں ان میں انسانیت و شرافت تو ہوتی۔“

”یہی تو تم میں امتحان پڑتا ہے۔“ وہ دھیرے سے ہنسا۔ ”یہ دنیا ایسے لوگوں سے
”عمری پڑی ہے جو عورت کو محض کھلونا سمجھتے ہیں۔ اور تم رات کی تاریکی میں کھل رہی تھیں۔
ایسے دہرائوں میں تنہا لڑکی کا مل جانا ایسا ہی ہے جیسے اصول ہیرا پڑا مل جائے۔ اور

سوٹ ہارٹ! بہت کم لوگ دنیا میں ایسے ہوتے ہیں جو اپنے عہد کی پاسداری گزارنے کی
مرغرو کی خاطر دریا کے قریب ہوتے ہوئے بھی باوجود پیاس کے خود کو ہیرا ب کرنے
سے باز رکھتے ہیں۔“ اس کے دہیہ چہرے پر ضبط کی سرخی چھانے لگی تھی۔

”مجھے ان دابیات ناموں سے نہ پکاریں تو مہربانی ہوگی۔“

”پھر نیک پروین یا ملائی جی کہہ کر پکاریں؟“ وہ شکست کھانے والوں میں سے نہ تھا۔
”مجھے کسی بھی نام سے پکارنے کی زحمت گوارا نہ ہی کریں تو بہتر ہے۔ اور آپ
یہاں سے چلے جائیں۔“ وہ جھنجھلا کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”اوکے۔ مجھے امید ہے اب دوبارہ تم یہ غلطی دہرانے کی کوشش نہیں کرو گی۔ اگر دل
نہ مانے تو خود کو چودہ انگلیشن لگوانے کے لئے تیار کر کے باہر نکلے گا سوچنا۔ کیونکہ باہر
اس وقت دجاہت سومرو کے شکاری کتوں کی حکومت ہے۔ پہلے میں نے منع کر دیا تھا۔“
وہ مسکراتا ہوا باہر چلا گیا تھا۔ اس نے اٹھ کر دروازے کی اندر سے کڑی لٹائی اور آ کر
بیڈ پر بیٹھ گئی۔ وہ جھوٹ نہیں کہہ رہا تھا۔ باہر سے کتوں کے بھونکنے کی آواز کمرے تک آ
رہی تھی۔

کیا زندگی ہے میری۔ عذاب و عذاب کے بھنور میں چکراتی ہوئی۔ ایک پریشانی
ختم نہیں ہوتی کہ دوسری اپنے بیچوں میں جکڑ لیتی ہے۔

مجھے بہت زیادہ چاہ تو نہیں۔ صرف عزت کی پُر دکار زندگی، طمانیت بھری تھوڑی سی
خوشحالی کی ہی تو چاہ تھی۔ مجھے سوائے مسعود برحق کے کسی بشر کے آگے اپنا ہاتھ پھیلا نا نہ
پڑے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ جو لوگ شکر کرتے ہیں اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے انہیں
صرف شکر ہی میسر ہوتا ہے۔ پریشانیوں میں وہ دھستے چلے جاتے ہیں۔ اور جو رب کا شکر
کرنا نہیں جانتے، وہ سر سے پاؤں تک ہر لمحہ، ہر ساعت کرم نوازیوں میں پھیلے رہتے
ہیں اور ایک وقت میں خدائی کا دعویٰ کر بیٹھتے ہیں۔ قسمتوں میں اتنا تضاد کیوں ہوتا ہے؟
انسانی کہتی ہیں، ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ اللہ جو کرتا ہے بندے کی بہتری کے لئے
کرتا ہے۔ ہمیں اس سے شکوہ کرنے کا بالکل بھی حق نہیں ہے۔ ہم کون سے ان کے

حقوق و احکامات کی بجا آوری و پابندی سے کر رہے ہیں۔ پانچ وقت سجدے کرتے ہیں تو سر سجدے میں ہوتا ہے اور من میں اپنے مسائل اور دنیا کی باتیں اُدم چاتی ہیں۔ خشوع و خضوع ہماری نمازوں سے غائب ہو چکا ہے۔ قرآن کو بھی ایک کتاب کی طرح پڑھا، چوما اور چمکدار جزدان میں لپیٹ کر سب سے اونچی جگہ پر رکھ دیا۔ بس یہی تنظیم ہماری نگاہوں میں ہے۔ کبھی اسے سمجھ کر پڑھنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی کوشش ہم نے نہیں کی۔ ہم تو شکوہ شکایت کرنے کے بھی مجاز نہیں ٹھہرائے گئے۔

اب بھلا ہم جیسے قصب کے مارے لوگ کہاں جائیں؟ کس سے انصاف طلب کریں؟ میں نے اپنی زندگی میں مرد کو کسی حوالے سے نہیں دیکھا تھا۔ آپ میری پیدائش سے دو ماہ قبل ایک روڈ ایکسٹنٹ میں مجھے شکم مادر میں ہی تھیں کی چادر اوڑھا کر چلے گئے تھے۔ پہلی اور آخری اولاد ہونے کے باعث مرد کے اس رشتے سے بھی سابقہ نہ پڑا جو بھائی کہلاتا ہے۔ رشتے واروں میں سوائے انانی کے کوئی دوسرا رشتے دار نہ تھا۔ ماں کی کھوکھ میں ہی مجھ پر مصیبتوں اور پریشانیوں کے کبھی نہ ختم ہونے والے سائے پڑ چکے تھے۔ بچپن میرا بالکل اسی مفلسی میں گزرا جیسا ایک غریب و یتیم بچی کا گزرتا ہے۔ امی اور انانی کورات دن مشین پر جھکا دیکھ کر میرے دل میں یہ خواہش جڑ پکڑ چکی تھی کہ پڑھ لکھ کر مجھے اچھی سی چاب کرنا ہے اور ان دونوں کے تمام دکھ درد سمیٹ لیتا ہے۔ کبھی عام بچوں کی طرح گلیوں میں نہیں کھیلتی اور نہ ہی میری کوئی سہیلی تھی۔

میری دوستی کورس کی کتابوں سے تھی اور اس دوستی نے ہر کلاس میں مجھے ٹاپ پوزیشن دلوائی تھی۔ میٹرک کے بعد جب میں نے کالج میں فرسٹ ایئر میں ایڈمشن لیا تو ساتھ ہی گھر میں ٹیوشن سینٹر کھول لیا۔ اس طرح خرچے کا بندوبست ہو گیا تھا۔

امی کی طبیعت بھی اب کافی دنوں سے درست نہیں رہتی تھی۔ بخار اور کھانسی کی شکایت اکثر رہنے لگی تھی۔ پھر جب خواب کی تعبیر ملنے کے دن آئے تو امی نے اپنا فیصلہ سن کر ایک ہی ضرب سے سارے خواب چٹکانا چور کر ڈالے۔ وہ ماضی میں کھو گئی! "شادی؟ لیکن امی، میں ابھی شادی کرنا نہیں چاہتی۔ میں نے گریجویشن اس لئے

نہیں کیا کہ ہاتھ پیلے کر کے آپ کو بے سہارا چھوڑ کر چلی جاؤں۔ ابھی میرے بہت سے خواب اصورے ہیں۔ مجھے بیابان کر آپ کی خدمت کرنی ہے، آپ کا بوجھ اٹھانا ہے۔ آپ نے بہت تکلیفیں اٹھائی ہیں میری خاطر۔ اب مجھے خدمت کرنی ہے آپ کی اور انانی کی۔ میں نے دو جگہ اپلائی کیا ہے ملازمت کے لئے۔ آج کل میں جواب آ جائے گا۔"

"ہمیں تمہارے سہارے کی ضرورت نہیں ہے بیٹی! صرف اللہ کا سہارا درکار ہے۔ ہمارے ہاں لڑکیوں سے نوکری کروانے کا رواج نہیں ہے اور نہ ہی تمہیں اس خیال سے تعلیم دلوائی ہے کہ تمہاری کمائی پر ہم گزارہ کریں گے۔" امی کے نرم لہجے میں بھی ترشی شامل تھی۔

"امی! یہ کوئی معیوب بات نہیں ہے۔ کیا آپ دونوں نے گھر بیٹھ کر محنت نہیں کی؟" "گھر بیٹھ کر محنت کرنے اور باہر نکل کر کام کرنے میں بہت فرق ہے بیٹی۔ یہ وقت بہت خراب ہے، اس دور میں بہن، بیٹی جیسے معتمد و پاکیزہ رشتے کم طرف لوگوں کی گندی ذہنیت سے اپنا مقام کھو چکے ہیں۔ میں نہیں چاہتی میری بیٹی کسی کی گندی نگاہوں کا نشانہ بنے۔ میری آرزو یہی ہے کہ تم عزت و آبرو سے ہماری دعاؤں کے سنگ اپنے اصل گھر سدا رہو۔"

"لیکن امی! میں اس کے لئے ہرگز تیار نہیں ہوں۔" اس کی فطری ضد عموماً کڑی۔ بھلا اس دن کے لئے اس نے تعلیمی میدان میں سخت ترین جدوجہد کی تھی کہ جب کچھ کر دکھانے کا موقع آئے تو وہ عام لڑکیوں کی طرح گھونگھٹ میں منہ چھپائے ایک انجان شخص کے ہر لہو ان دونوں کو بے آسرا چھوڑ کر چلی جائے اور اپنی زندگی میں مست ہو جائے۔ وہ اتنی خود غرض و موق پرست نہیں تھی۔ اس کی زندگی کا مقصد انہیں صرف اور صرف خوشحال زندگی دینا تھا۔ خود کو مٹا کر انہیں خوشیاں اور سکھ دینا تھا۔

ان دونوں کے لاکھ سمجھانے کے باوجود وہ اپنے انکار پر قائم رہی تو امی نے اپنی بات منوانے کے لئے بھوک ہڑتال کر دی۔

گھر میں ویرانی و اُداسی بال بکھڑائے گھومتی تھی۔ انا بی ان دونوں ماں بیٹی کو سمجھانے میں ہر طور کا کام رہی تھیں۔ پورا ایک دن گزر گیا تھا۔ اسی نے پانی تک نہ پیا تھا۔ بخار کی شدت نے انہیں پھر آن گھیرا تھا اور کھانسی نے ایک ایک جوڑ ہلا ڈالا تھا۔

”ای انا رہا تھی مجھ سے ہے۔ پھر آپ کھانا کیوں نہیں کھا رہی ہیں؟ انا بھی بھی کل سے کچھ کھاتی نہیں رہی ہیں۔ اور دیکھیں آپ کو بخار کتنا ہو رہا ہے اور کھانسی تو بار بار آ رہی ہے۔ پلیز آپ کچھ کھالیں تاکہ دوائی کھائی جاسکے ورنہ طبیعت مزید خراب ہو جائے گی۔“ اس سے آخر کار ان کی حالت نہ دیکھی گئی تو وہ ان کے قریب بیٹھ کر گھو گھو کر لہجے میں بولی۔

”اچھا ہے، طبیعت زیادہ خراب ہوگی تو اس زندگی کی قید سے آزاد ہو جاؤں گی۔“

”ای انا اللہ نہ کرے۔ میری عمر بھی آپ کو لگ جاسے۔“ وہ تڑپ کر بولی۔

”کرتی رہتا میرے بعد اپنا من مایاں۔ تمہیں میری فکر کیا ہے؟ کہاں خیال ہے ماں کی حالت کا۔ کتنی خوش تھی میں کہ اپنی زندگی میں بیٹی کو وداع کروں گی۔ مگر بیٹی اتنی خود سر اور ضدی ہوگی جو صرف اپنی چلانا جانتی ہوگی اس کا تو مجھے احساس ہی نہ تھا۔ ہاں جاؤ کرو اپنی خوشی پوری۔ ماں کی خواہش اور فرض سے تمہیں کیا فرض۔“

”ای امی۔“ وہ بری طرح رو دی ان کی بدگمانی پر۔ لیکن ان کا دل نہ کھلا۔

”مجھے سمجھنے کی کوشش کریں امی! مجھے غلط مت سمجھیں۔“

”خاموش رہو۔ سمجھنے سمجھانے کا وقت گزر گیا۔ میں بھی پاگل۔۔۔۔۔“ اس بار کھانسی کا اتنا شدید دورہ پڑا تھا کہ انہیں سنبھالنا دشوار ہو گیا۔

”قاخرو! دو گھنٹ پانی پی لو۔ حلق بالکل خشک ہو گیا ہے۔“ انا بی اس کے ہاتھ سے گلاس لے کر ان سے منت بھرے لہجے میں بولیں۔

”تمہیں انا بی! میں نے قسم کھائی ہے۔ جب تک یہ میرا کہنا نہ مانے گی میرے لئے ایک گھنٹ پانی پینا بھی حرام ہے۔“ وہ تکلیف سے بے حال اٹھ لہجے میں بولیں۔

”کیوں بچوں کی طرح ضد کر رہی ہو قاخرو! بچی کے ساتھ بچی بن رہی ہو۔ ماں

جائے گی۔ اسے سوچے سمجھنے کے لئے کچھ وقت دو۔ یہ تمہارا خون ہے۔ بھلا تمہارے فیصلے سے انحراف کا حوصلہ کر سکتی ہے؟“ انا بی انہیں سمجھاتے ہوئے خود بھی رو پڑی تھیں۔ وہ ان کے پاس بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔

”سب جتن کرنے کے بعد بھی آپ اس کے حوصلے کی بات کر رہی ہیں انا بی۔ حیرت ہے، اسے میری نہیں اپنی پرواہ ہے۔ ماں کا فیصلہ اس کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ میں ماں نہیں دشمن ہوں اس کی۔ اس کے لئے برا چاہوں گی تا۔ مرنے والے دو مجھے۔“

”ای۔۔۔۔۔ امی! آپ ایسا نہ کہیں۔ مجھے آپ کی بات منظور ہے آپ کے ہر فیصلے پر میں جان لٹانے کو تیار ہوں۔ آپ جو کہیں گی میں کرنے کو تیار ہوں۔“ وہ رو دی ہوئی ان سے لپٹ گئی تو انہوں نے بھی روتے ہوئے اسے سینے سے لگا لیا تھا۔

”میں کہتی ہوں لڑکے کی عمر کتنی ہے۔ ہماری حضری کے ساتھ اس کا جوڑ مسج نہ رہے گا۔“ وہ شام کی چائے بنا رہی تھی جب انا بی کی دبی دبی آواز گھن سے سنائی دی۔

”آپ نے بھی اتنی عمر کہاں گنوائی ہے۔ میرا تجربہ کہتا ہے، بڑی عمر کے مرد و جوان و حسین بیوی کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ اشاروں پر ناپتے ہیں۔ اور جوڑ والے مرد تو لانا بیویوں کو کینرہ کر رکھتے ہیں۔ رات دن خدمت کرتی ہیں لڑکیاں تب بھی وہ توجہ و محبت نہیں پاتیں جو ایسے مرد دیتے ہیں۔ دیکھنا رافع فیاض حضری کو رانی بنا کر رکھے گا۔ میری بچی وہاں ہر وہ سکھ دیکھے گی جو ہم بد نصیب اسے نہ دے سکے۔“ قاخرو کے لہجے میں گزری محرومیوں کے عکس میں آنے والے سنہری مستقبل کی پرچھائیاں لرزاں تھیں۔ چائے گوں میں نکالتے وقت اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے۔ اس کے اور امی کے جذبے میں ایک قدر مشترک تھی کہ اگر وہ ان کے بہتر دنوں کی خواہش رکھتی تھی تو وہ بھی اس کے بہترین مستقبل کے لئے کوشاں تھیں۔

”اچھی طرح معلومات تو تم نے حاصل کر لی ہیں تا رافع فیاض کے بارے میں؟“ انا بی کسی طور مطمئن دکھائی نہ دے رہی تھیں۔

”ہاں۔۔۔۔۔ ہاں۔ حاجی صاحب کا دیکھا بھالا ہے۔ انہوں نے ضمانت دی ہے۔ بے

چارے کا کوئی نہیں ہے اس لئے تھوڑی عمر زیادہ ہو گئی ہے۔ کاروبار بھی اپنا ذاتی ہے۔ اسکرپ کا خاصا بڑا کاروبار ہے۔ اس کی نیت کا ہمیں سے اندازہ لگا لو کہ جہیز کے نام پر کچھ لینے کو تیار نہیں بلکہ میں نے کہا بھی کہ میں جلد شادی نہیں کر سکتی اپنی بیٹی کی تو بڑی چاہت و اپنائیت سے یوں۔ ماں جی! جہیز کے نام پر میں پھوٹی کوڑی لینے کا بھی روادار نہیں ہوں۔ میرے پاس جو کچھ بھی ہے آپ کی بیٹی کے نصیب کا ہی ہے۔ آپ تو صرف اس چاند کو پھرے آئینوں میں اتار دیں۔ میری زندگی میں اجالا ہی اجالا نکھر جائے گا۔ نہ معلوم کب اس نے خضریٰ کو دیکھا اور حاجی صاحب سے خواہش کر بیٹھا۔

وضوح دار اور بادقار ماں کے منہ سے نکلنے والے آخری جملے نے اس کو پشیمردہ کر ڈالا تھا۔ تہا و بے سہارا ہونے کے خیال نے شاید ان کی سوچوں کو بھرج کر کیا تھا جو وہ اس انداز میں سوچتے پر مجبور ہو گئی تھیں۔ رافع فیاض کو بہت جلدی تھی اور فاخرہ کو اس سے بھی زیادہ۔ سو مٹکی کا جھپٹ ہی نہ رکھا گیا، سیدھے سبب و شادی کی تاریخ رکھ دی گئی۔

رافع فیاض کے انکار کے باوجود فاخرہ اور انابی حسب استطاعت اس کے لئے جہیز تیار کر رہی تھیں۔ وہ اس دوران خاموش تماشاخی بنی ہوئی تھی۔ آخر کار وہ دن بھی آ ہی گیا کہ اسے پہلے جوڑے میں کرن لگا دو پند اور جا کر مایوں کی رسم ادا کر دی گئی۔ چند ہمسائیوں کے علاوہ حاجی صاحب اور ان کی بیوی نے بھی شرکت کی تھی۔ حاجی صاحب اور ان کی بیوی اس وقت دی آئی بیز کی حیثیت کے حامل تھے۔

رافع فیاض کی جانب سے وہ اگر اس کے بزرگ بنے ہوئے تھے تو یہاں بھی خضریٰ حیات کے بڑوں کا حق وہی ادا کر رہے تھے۔ دونوں جانب ان کی خوب آؤ بھگت ہو رہی تھی۔ اپنی بساط سے بڑھ کر انہوں نے اس کے لئے جہیز بنایا تھا۔

زیورات میں طلائی چوڑیاں، ننگن اور خوبصورت کانوں کی بالیاں تھیں جو ای نے اس کے شوق کے پیش نظر ایک عرصے سے روپیہ جوڑ جوڑ کر جوئی تھیں اور شادی والے دن خود اپنے ہاتھوں سے اس کی سرسریں کلائیوں میں پہنا کر کتنی دیر اس کے ہاتھوں کو اپنے چہرے سے لگا کر روٹی رہی تھیں۔ بارات میں بہت مختصر لوگ آئے تھے۔ نکاح

سے قبل نہ معلوم کس نے یہ شوشا چھوڑا کہ پہلے یہ گھر دولہا کے نام کیا جائے پھر نکاح ہو گا۔

ان دونوں کے حواس گم ہو گئے تھے۔ انہیں یہ امید نہ تھی کہ بارات دہلیز پر لانے کے بعد وہ یہ مطالبہ کریں گے۔ صلاح و مشورے کے بعد وہ یہ فیصلہ کر چکی تھیں کہ مکان وہ رافع فیاض کے نام کر دیں گی لیکن خضریٰ نے دھمکی دے دی کہ اگر مکان اس کے یا رافع فیاض کے نام کیا گیا تو وہ نکاح کرنے سے انکار کر دے گی اور یہ بات جب رافع فیاض کے کانوں تک پہنچی تو وہ صاف مکر گیا کہ اس کی طرف سے ایسا کوئی مطالبہ نہیں کیا گیا۔

نکاح کے بعد کھانے کا پروگرام تھا کیونکہ بارات میں کتنی کے لوگ شامل تھے۔ فاخرہ نے کھانے کا اہتمام کر لیا تھا۔ دواغ ہو کر وہ رافع فیاض کے فلیٹ میں آ گئی۔ یہاں اس کا سواگت کرنے کے لئے کوئی نہیں تھا۔ حاجی صاحب کی بیوی اسے سچے ہوئے پیڑروم تک چھوڑ کر گئی تھیں۔ اس نے نگاہیں اٹھا کر دیکھا، کمرہ روایتی انداز میں پھولوں سے سجایا گیا تھا۔ فرنیچر اور دوسرا سامان سب کا سب اس کے جہیز کا ہی تھا۔

باہر قدموں کی آواز ابھری تو وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ آج اس کی زندگی کی یہ اہم اور انوکھی رات تھی جس کا تصور ہی نہایت حسین و کیف آور ہوتا ہے۔ لیکن اس کے دل میں ایسی کوئی خواہش نہ ابھری تھی جس سے جذباتوں میں لچل پچل۔ لچل پچنے کے لئے جذباتوں کی صداقت بڑی اہم حیثیت رکھتی ہے۔ یہاں نہ کوئی خواہش تھی اور نہ ہی جذبات۔ ماں کی خاطر وہ اپنی خواہشات کا قتل کر کے رافع فیاض کے ساتھ آئی تھی۔ یہاں تک آتے آتے اس کی خواہش اور آرزوئیں جل کر خاک ہو چکی تھیں۔ جہاں پر خواہشیں مرجائیں، وہاں سمجھوتے زندہ رہ جاتے ہیں۔ رافع فیاض کے ساتھ وہ سمجھوتہ کرنے آئی تھی۔ ماں کو خوش رکھنے کی خاطر سب کچھ منظور تھا۔

کمرے کا دروازہ دھڑ سے کھلا تھا۔ اس نے گھبرا کر دیکھا۔ ایک درمیانی عمر کی فیشن ایبل عورت کے ہمراہ دوسری بڑی عمر کی بڑھیا خطرناک تیز لئے اندر داخل ہو رہی

تھیں۔ ان دونوں کے چہروں میں اتنی مشابہت تھی کہ بغیر جانے ہی معلوم ہو رہا تھا کہ وہ ماں بیٹی ہیں۔ ان کے انداز اسے خطرناک ارادے ظاہر کر رہے تھے کہ وہ بے اختیار کھڑی ہو گئی۔ اسی پہ دو صحت مند مرد ایک بانس کی طرح لمبے سوکھے، گہری سانولی رنگت کے مرد کو گر بیان سے پکڑ کر وہاں لے آئے اور قاتلو سامان کی طرح فرش پر پٹخ دیا۔ آف وہائٹ پانچاھے اور شیروانی میں ملبوس اس شخص کو دیکھ کر وہ سمجھ گئی کہ وہی رافع فیاض ہے۔ اس کا شوہر نامہ اراکین اس حالت میں؟

”کیوں بھیجی، تم نے ہمیں بالکل ہی احمق سمجھ لیا تھا؟“ وہ بڑھیا آگے بڑھ کر غصے سے فرش پر پڑے رافع سے مخاطب ہوئی۔

”ایک بیوی تو تم سے سنبھالی نہیں جاتی اور اب دوسری لے آئے ہو۔“ وہ عورت کم صم کھڑی خضریٰ کو دکھا جانے والی نگاہوں سے گھورتی ہوئی بولی۔

”جسٹیس کیا نظر آیا تھا اس لنگور جیسی شکل والے میں؟ ہاں شاید تم سوچ رہی ہو کہ والدہ ارادی ہے، اپنے حسن کے جال میں پھنسا کر سب کچھ لوٹ کر لے جاؤ گی۔“ بڑھیا جو شکل سے ہی لڑاکا دکھائی دے رہی تھی اس کی جانب بڑھتے ہوئے غصے سے بولی۔

”اس کا حسن تو میں ابھی برباد کر کے جزیل بنادوں گی۔ اس نے میرے حق پر ڈاکا ڈالنے کی جرأت کی ہے۔ میں اس کا خون پی جاؤں گی۔“ دوسری عورت زنجی مانگن کی طرح تل کھا رہی تھی۔ اس کے لہجے سے حد درجہ سفاکی و درندگی جھلک رہی تھی۔

”میر کر درخسانہ! پہلے اس مردود سے نمٹ لیں پھر اس چھو کڑی کو بھی زندہ دفن کر دیں گے۔“ وہ دونوں بچے کئے آدمی خضریٰ کو گھورتے ہوئے گرج کر بولے۔ ان کی لاتیں بڑی بے دردی سے رافع فیاض کے جسم پر پڑ رہی تھیں اور اس کے منہ سے نکلنے والی کراہیوں سے کمرہ گونج اٹھا تھا۔ وہ بری طرح ہاتھ جوڑ کر معافیاں مانگ رہا تھا، گڑگڑا رہا تھا مگر ان پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ مارے جارہے تھے۔

”ہم ایک جتنے کے لئے شہر سے باہر کیا گئے تو نے ہماری بہن پر سوکن لاکر بٹھادی۔“ ”جتنے ہم نے عزت والی زندگی دی اور تو نے یہ صلہ دیا ہے احسان فراموش۔“

درخسانہ کا بڑا بھائی تو غم و غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔

”جتنے تو میں مٹی کا تیل ڈال کر جلا کر ماروں گی۔ تو میری جگہ کس طرح لے سکتی ہے کیا؟“ درخسانہ نے غصے سے بھڑکتے ہوئے اسے دونوں ہاتھوں سے نوچتا چاہا مگر خضریٰ اس کا ارادہ بھانپ کر دور ہٹ کر سخت لہجے میں بولی۔

”پہلے میری بات سنو، یہ شخص محبوب ہے مکار ہے۔ اس نے خود کو لا وارث اور غیر شادی شدہ ظاہر کر کے شادی کی ہے۔ اگر پہلے معلوم ہو جاتی یہ حقیقت تو ایسا کچھ نہ ہوتا۔ مگر بے فکر رہو، میں تمہاری جگہ لینے آئی ہوں اور تمہارا حق چھیننے۔ رافع فیاض تمہارے تھے اور تمہارے ہی رہیں گے۔ میں تمہارے درمیان سے نکل رہی ہوں۔“ اس نے ٹھہرے ٹھہرے مضبوط لہجے میں کہا تو وہ چاروں لمبے بھر کو دم بخود رہ گئے۔

”شاید آپ کو میری باتوں پر یقین نہیں آ رہا، اس سے زیادہ میں آپ کو سمجھانے سے قاصر ہوں۔ مگر یہ فیصلہ اٹھانے میں اب اس شخص کے ساتھ کبھی نہیں رہ سکتی۔“

”اگر تو اتنی ہی بچی اور وعدے کی پابند ہے تو یہ سب زیور ہمیں اتار کر دے۔ اور سن،“ ”جتنے رافع سے طلاق لیتی ہو گی اور جتنے کوئی سامان واپس نہیں ملے گا۔“ درخسانہ اس کے قریب آ کر شرطیہ انداز میں کہنے لگی۔ اس کی باتوں کی تائید ان تینوں نے بھی کی، جبکہ رافع فیاض ظالمانہ مار سے بے ہوش پڑا تھا۔

”منقول ہے مجھے۔“ اس نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے فوراً جواب دیا۔

”چل جا۔ طلاق تو جتنے ابھی مل جاتی لیکن یہ منجوس آدمی اس حالت میں نہیں ہے۔“ کئی برسوں جتنے طلاق کے کاغذات مل جائیں گے۔“ درخسانہ نے زیورات سمیٹتے ہوئے فخریہ لہجے میں کہا اور فرش پر پڑے ہوش و خرد سے بیکار رافع فیاض پر نفرت انگیز نگاہیں ڈال کر خاموشی سے باہر نکل آئی۔

”ہم تو جیسے ہی سرمے حاجی صاحب! جب آپ کو اس کے بارے میں معلوم نہ تھا تو کیوں متانتی بنے تھے؟ کیوں اس کی باتوں میں آ کر آپ نے میری بھول سی بچی کے

نصیب پر سیاہی پھیلا دی؟ ہم نے آپ پر اعتبار کیا، اپنا بزرگ سمجھا، لیکن یہی تصور تھا ہمارا؟“ فاختہ نے دوپٹے کے پلو سے آنسو صاف کرتے ہوئے ان سے شکوہ کیا۔

”اس میں تمہاری بیٹی کے نصیب کا دوش ہے۔ ہمیں تصور وار کیوں ٹھہراتی ہو بی بی! میں تو پہلے ہی کہہ رہی تھی نہ پڑیں ان چکروں میں۔ آج کل لوگ ہیں نیا احسان فراموش اور مطلب پرست۔ کل ہم سے اچھا کوئی نہ تھا آج ہم میں کیڑے نظر آ رہے ہیں۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ اچھا ہوا تو اللہ نے کیا اور برا ہوا تو بندے بدنام ہوتے ہیں۔ ارے ہمیں بخشو بی بی! آئندہ ہم سے کوئی تعلق رکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم جانو، تمہاری بیٹی جانے۔ ہم نے تو سب نیک نیتی سے کیا تھا۔ برائی تو تمہاری بیٹی کے نصیب میں لکھی تھی۔“ حاجی صاحب کی تنبیہ جو ہر معاملے میں پیش پیش تھیں، اب حقیقت حال عیاں ہونے پر کوئی الزام اپنے سر لینے کو تیار نہ تھیں، لہذا انہیں ہی مورد الزام ٹھہرا کر بڑبڑاتی ہوئی حاجی صاحب کے ساتھ وہاں سے چلی گئیں۔

”کوئی نہیں ہے، میں خود مے دار ہوں اپنی بیٹی کی زندگی تباہ کرنے کی۔ اس نے تو کتنا انکار کیا، ہر دلیل سے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر میری عقل پر ہی بھروسہ کر لیں تھے جو اس کی ایک نہ بانی۔“ فاختہ خود کو کوستے ہوئے رونے لگیں۔

”امی! کب تک خود کو الزام دیتی رہیں گی۔ یہ میری سیاہ بختی ہے جو اس وقت سے میرا پیچھا کر رہی ہے جب میں نے اس دنیا میں قدم بھی نہ رکھا تھا۔“ وہ ان کے قریب بیٹھ کر ان کے آنسو صاف کرنے لگی۔

”بہت ہمت والی ہے میری بیٹی۔ ایسا صدمہ کس خاموشی سے برداشت کر رہی ہے۔“ انہوں نے شفقت سے اسے پٹایا۔

”آداب عرض ہے جی!“ آواز تھی کہ دھماکا۔ دونوں ہی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

”تم! تمہاری ہمت کیسے ہوئی یہاں قدم نہ رکھنے کی؟“ فاختہ اس تک پہنچ کر غصے سے بولیں۔ مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اسی طرح ڈھٹائی سے مسکراتا ہوا بولا۔

”تین ہفتے بعد آیا ہوں، اس لئے قصہ دکھا رہی ہیں ساسو جی! درست ہے آپ کا

قصہ۔ لیکن ان سالوں نے کچھ مرمت ہی اس بے جگری سے کی تھی کہ زخم بھرنے اور ٹوٹے ہاتھ کا پلسٹر کھلنے میں دو ہفتے لگ گئے۔ ایک ہفتہ رخسانہ کو یہ یقین دلانے میں لگ گیا کہ میں نے خضریٰ کو طلاق دے دی ہے۔ اب میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یقین آتے ہی اس نے میری مگرانی بند کرادی اور میدان صاف دیکھ کر میں یہاں چلا آیا۔“

”اگر تم میں ذرا بھی غیرت ہوتی تو یہاں آنے کی بجائے سمندر میں ڈوب مرتے۔“ خضریٰ اسے گھور کر بولی۔

”عجیب بیوی ہو، شوہر کا خوش خوشی استقبال کرنے کی بجائے کیسی بے سرو پا ہاتھ کر رہی ہو۔ چلو تیار ہو جاؤ، میں تمہیں سمندر کی سیر کروا لاتا ہوں۔“ اس نے خار ہونے والی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے لاڈ بھرے لہجے میں کہا۔

”مجھے تم سے، تمہارے نام سے کچھ نہیں لینا۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے ورنہ دھکے دے کر نکال دوں گی۔ کبھی کے بچے پاگل سمجھ کر تمہیں پتھر ماریں گے۔“

”ساسو جی! یہ تربیت کی ہے تم نے اپنی بیٹی کی؟“

”تم جیسے سے تو پھر بھی خاصی بہتر کی ہے۔“ وہ خاصی ترکی بہ ترکی بولی۔

”کیوں بحث کرتی ہو، میں تمہیں وہ سب کچھ دوں گا جس کا کبھی تصور بھی.....“

”شٹ اپ، نکل جاؤ، فوراً نکل جاؤ یہاں سے۔“ وہ زور سے چیخی تھی۔

زندگی ایک دم ہی بوجھل ہو گئی تھی۔ اس کے غم کو فاختہ نے جی کا روگ بنا لیا تھا۔ بیمار تو وہ ایک عرصے سے تھیں کہ غربت و بے چارگی دنیا کی بدترین بیماری ہے۔ بیٹی پر گزرنے والی قیامت نے انہیں موم کی طرح اندر ہی اندر پگھلائے شروع کر دیا تھا۔ رافع فیاض، خضریٰ سے دستبردار ہونے کو راضی نہ تھا۔ اکثر اوقات آن و دمکتا اور یہی مطالبہ کرتا کہ خضریٰ اس کی بیوی ہے اور وہ اسے ساتھ لے کر جائے گا۔ یہ بات خضریٰ کسی طور ماننے کو تیار نہ تھی۔ اس کا کہنا تھا وہ دل میں اس سے تعلق توڑ چکی ہے۔ اب وہ مانے یا نہ مانے مگر وہ اسے اپنا شوہر نہیں مانتی۔ اسی کشمکش کے دوران وہ ایک رات ایسی

سوئیں کہ پھر کبھی اس رات کی صبح نہیں ہوئی۔ انا بی اور خضر کی کو چھوڑ کر وہ ہمیشہ کے لئے دنیا سے چلی گئیں۔!

وقت گزر رہا اور احساس دلانے لگا کہ اسے پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے مگر سے باہر قدم رکھنا پڑے گا۔ بہت کوشش کے بعد ایک پرائیویٹ انگلش اسکول میں اسے جاب ملی تھی جہاں محنت بہت زیادہ اور سیکری برائے نام تھی۔ مشکل سے دال روٹی مل پاتی تھی۔ اس دوران رافع فیاض نے انہونی بات کی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ شادی کے لئے اس سے فاخرہ نے ایک لاکھ ادھار لئے تھے جو ایک سال بعد واپس کرنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔

”دھوکے باز انسان۔ یہ تمہاری کوئی نئی گھٹیا سازش ہے۔ شرم نہیں آتی میری مرحوم ماں پر جھوٹے الزام لگاتے ہوئے۔ کچھ تو اللہ کا خوف کرو۔ کیا تمہیں موت نہیں آئے گی؟ کیوں میری مظلوم ماں کی روح کو آزار پہنچا رہے ہو؟“ وہ غضب ناک انداز میں بولی تو وہ اطمینان سے بولا۔

”اگر تمہاری ماں نے تمہیں نہیں بتایا تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟“

”اے میاں! ہم کیسے یقین کر لیں۔ میرے سامنے خود فاخرہ نے سب کچھ اپنے پاس سے کیا۔ وہ مجھ سے کوئی بات چھپانے والی نہیں تھی۔ اگر ایسی بات ہوتی تو وہ ضرور ذکر کرتی۔ ایک لاکھ کی رقم کوئی معمولی رقم نہیں ہوتی۔“ انا بی بھی سخت لہجے میں اس کی بات کی نفی کرتی ہوئی بولیں۔

”ہمیں.....“ وہ ہاتھ اٹھا کر حکم بھرے انداز میں گویا ہوا۔ ”مجھے میری رقم جلد از جلد مل جانی چاہئے۔ جتنی جلد میری رقم ادا کرو گی اتنی ہی جلد میں تمہیں آزادی کا پروانہ دے دوں گا۔ مگر ایک سال کے اندر اندر میری رقم مجھے نہ ملی تو یاد رکھنا کبھی طلاق نہیں دوں گا۔“

اسے معلوم تھا وہ دھمکی محض دھمکی نہیں ہے بلکہ اس کی سازش کا حصہ ہے۔ اسے حاصل کرنے کے لئے اس نے گھٹیا ترین چال چلی تھی ورنہ وہ اپنی ماں کی خود دار اور غیور

طبیعت کو اچھی طرح جانتی تھی۔ جس عورت نے قاتلوں کی حالت میں کسی سے ایک روٹی مانگنا گوارا نہیں کیا وہ بھلا بیٹی کی شادی کے لئے اس شخص سے قرض لیتیں جو ان کا داماد بننے والا تھا؟

”فاخرہ ایسی نہیں تھی۔ وہ کبھی اتنی بڑی رقم بطور قرض نہیں لے سکتی تھی۔“ اس کے جاننے کے بعد انا بی خضر کی سے مخاطب ہوئیں۔

”مجھے معلوم ہے انا بی اور وہ ذلیل کس وجہ سے ایسا کر رہا ہے، وہ بھی آپ جانتی ہیں۔ ہماری بجدوری یہ ہے کہ ہم سچ کو سچ ثابت کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔“

”میری بھی آنکھیں ساتھ چھوڑنے لگی ہیں ورنہ سلائی کڑھائی کے روپوں سے دال روٹی مل ہی جاتی تھی۔ اب تم صبح سے لٹی شام کو آتی ہو۔ اتنی محنت کے باوجود اسکول والے چند سو روپے پکڑا دیتے ہیں جو ٹکلی اور گیس کے بل بھرنے کے بعد کتنی کے بچتے ہیں۔ پھر پورا مہینہ جس طرح گزرتا ہے، صرف اللہ ہی جانتا ہے۔“

”آپ فکر مت کیجئے انا بی۔ میں نے ایک بڑی جگہ اپلائی کیا ہے۔ شاید وہاں ملازمت مل جائے۔ خاصی پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔ خاصی بڑی کہنی ہے۔ آپ ایسا کریں اوپر کے پورشن کو کرائے پر دے دیں۔ میں سب سے پہلے اس خبیث شخص کے جھوٹے قرض سے آزاد ہونا چاہتی ہوں ورنہ ہم دو افراد کے لئے اتنی تنگ و دو کی ضرورت نہیں تھی۔“

”اللہ ہی ہمارا انتقام لے گا ظالم رافع فیاض سے۔ دھوکے سے شادی کی اور تمہیں سارا جھڑ بھی ہڑپ کر گیا۔ وہ تو مجھے ہی اوسان آ گیا تھا، ورنہ کے وقت جو میں نے تمہاری چوڑیاں اور کنگن فاخرہ سے یہ کہہ کر تمہاری کلائیوں سے اتروا لئے کہ ویسے پر پتا دیں گے۔ کالج کی چوڑیوں نے کلائیوں میں جگہ ہی کہاں چھوڑی تھی۔ اس طرح یہ جگہ کھینیں۔“

”میں نے یہ سوچ کر صبر کر لیا انا بی اوہ ہماری جانوں کا صدقہ کیا۔ آپ بھی یہی سوچ لیں۔“ اس نے دھیمے سے مسکرا کر انہیں سمجھایا تو وہ ٹھنڈا سا نفس بھر کر وہ گئیں۔

”آؤ! ماضی کس طرح اس کے ذہن کی اسکرین پر روشن ہو گیا تھا۔ رات دھیرے دھیرے گزر کر صبح کے روشن اجالے میں ڈھل چکی تھی۔ ایک ہی زاد بچے سے بیٹھے بیٹھے اس کی کمر اکڑ گئی تھی۔ آنکھیں جو ماضی و حال کے تکلیف دہ وقت کے احساس سے مسلسل برس رہی تھیں، بری طرح سرخ ہو کر سوچ گئی تھیں۔ اسی دم خود کی سی اس پر چھائی تھی۔

”سائیں! یہ تو دوستی والی بات نہ ہوئی نا۔ رات آئے اور اب جانے کی بات کر رہے ہو۔ کچھ دن رکو ابھی۔ کیوں ہماری عزت مٹی میں ملانا چاہتے ہو۔ وجاہت سومرو کی مہمان نوازی کے گمن تو دشمن بھی گاتے ہیں۔ پھر تو تم جگر چان ہو ہمارے۔ اس طرح نہیں جانے دیں گے۔“ سومرو نے اسے بڑے دلار سے روکنا چاہا۔

”یار! مجھے فخر ہے تمہاری دوستی پر۔ جانا ہوں تمہاری محبت کو۔ لیکن اس وقت میں عجیب ٹیلنس کا شکار ہوں۔“ اس نے سرکزی کی پشت سے نکال دیا۔ اس کی روشن پیشانی پر سوچیں ٹخنوں کی صورت میں ابھرائی تھیں۔ سحر انگیز مفرور آنکھوں کی سرخی میں الجھنیں تیرنے لگی تھیں۔ ”سمجھ میں نہیں آتا، آگے بڑھوں یا کراچی واپس لوٹ جاؤں؟“

”ہوں.....“ وجاہت سومرو اس کے قریب بیٹھ کر اس کی جانب بغور دیکھنے لگا۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟“

”اس بار تم بہت بد لے بدلے نظر آ رہے ہو۔“

”وہم ہے تمہارا۔ بھلا مجھے کون بدل سکتا ہے؟“ وہ دھیسے سے مسکرایا۔

”وہ لڑکی جو تمہارے ساتھ آئی ہے اور تم پہلی دفعہ کسی لڑکی کو ساتھ لا کر کمرے میں تنہا سوئے ہو اور اس کی وجہ سے تم نے ڈیرے پر جانے سے انکار کر دیا تھا۔“

”ایسی کوئی بات نہیں۔ شانزل خان کسی کا پابند نہیں ہو سکتا اور وہ بھی خصوصاً کسی لڑکی کا۔“ ایک لمحے کو اپنا لہجہ اسے خود بخود اپنی اور کھوکھلا لگا تھا مگر فوراً ہی اس نے اندر ابھرتے اضطراب پر قابو پالیا تھا۔

”اس سے قبل تو تمہیں کبھی کسی معاملے میں سوچنے کی ضرورت نہ پڑی تھی۔ نہ کبھی معمولی سی ٹیلنس بھی کبھی تمہیں چھو کر گزری تھی، پھر اب کیا ہوا؟“ وجاہت سومرو کھری نگاہوں سے اس کے رنگ بدلنے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”ایسی کوئی بات نہیں۔ خفرائی حیات کی حیثیت بھی انہی لڑکیوں جیسی ہے جو محض وقت گزاری کا سبب بنتی ہیں۔ بعد میں حرف غلط کی طرح ذہن سے جن کے نام اور چہرے مٹ جاتے ہیں۔“ اس نے بے تاثر لہجے میں کہا۔

”کاش..... تمہاری آنکھیں بھی تمہارے لہجے کا ساتھ دیتیں تو میں یقین کر لیتا۔“

”وہ شادی شدہ لڑکی ہے، اس لئے کسی بھی خیال کو دل سے نکال دو۔ اس کی نفلوں ہٹ دھرمی، ضد اور اکڑنے اب تک مجھے ضد پر اکسایا ہوا ہے۔ جس وقت وہ اپنی اصلیت پر آئی، چند ٹخنوں کو رنگین بنا کر بھول جاؤں گا اسے۔“

”نہ معلوم کیوں مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے..... خیر کچھ نہیں۔ میں تمہیں ابھی نہیں جانے دوں گا۔“ وجاہت سومرو نے دانستہ اس کی طرف دیکھ کر بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

شانزل نے اس کی ادھوری بات جاننے کی کوشش نہیں کی اور مزید یہاں ٹھہرنے سے معذرت کر لی۔ اپنی اس نئی بے چینی اور اضطرابی کیفیت کو وہ خود بھی نہ جان پایا تھا۔

”صاحب! بی بی صاحبہ دروازہ نہیں کھول رہی ہیں۔ صبح سے کئی بار کھٹکھٹا چکا ہوں۔“

”وہاٹ؟“ نور محمد کی اطلاع نے اس کے ہوش اڑا دیے تھے۔ وہ بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔

”دھمیراؤ نہیں۔ اگر تم اجازت دو تو ملازم روشن دان سے اندر جا کر دروازہ کھول دے گا۔“ وجاہت سومرو نے کہا۔

پوری طاقت سے دروازہ دھڑ دھڑانے کے باوجود بھی اندر سے کوئی آواز بلند نہ ہوئی تو وجاہت سومرو نے اجازت طلب کی اور اس کا جواب پاتے ہی ایک ملازم چھت کی طرف چلا گیا تاکہ وہاں سے روشن دان کے ذریعے کمرے میں داخل ہو سکے۔

”اوہ..... اتنی دیر..... وہ کب اندر داخل ہو گا؟“ وہ از حد متوجش تھا۔

”کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ کچھ نہیں ہو گا۔ روشن دان بہت اونچا ہے، اسے نیچے اترنے میں چند منٹ تو لگیں گے۔“

”تم نہیں جانتے، وہ نہایت احمق لڑکی ہے۔ کہیں اس نے..... کہیں اس نے خودکشی نہ کر لی ہو۔“ وہ نہایت پریشانی سے بولا۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔ گھبراؤ نہیں۔“ وجاہت سومرو نے خلوص سے تسلی دی۔ اسی دم ملازم نے دروازہ کھول دیا تو وہ وحشت زدہ سا اندر بڑھا تھا۔

بیڈ پر اسے بے سادہ پڑے دیکھ کر وحشت سے بچھا۔

”دیکھا..... دیکھا تم نے۔ ہو گئی نا وہی بات۔ خودکشی کر لی نا اس نے۔“

وہ متحش سائیڈ کی طرف بڑھا۔ خضری بیڈ پر بے سادہ پڑی تھی۔ شانزل نے تیزی سے ہاتھ بڑھا کر اس کی نبض چیک کی جو بہت ست رفتاری سے تپ رہی تھی۔ اس کے اندر چلتی آندھیاں شدت اختیار کرنے لگیں۔

”کیا ہوا؟“ وجاہت سومرو کچھ فاصلے پر کھڑا اس کی اضطرابی حرکات کا بغور جائزہ لے رہا تھا، اس کے چہرے پر پھیلتی وحشت اور پریشانی کو دیکھ کر پوچھنے لگا۔

”دیکھی..... دیکھی! یہ زندہ ہے لیکن حالت بہت سیریس ہے۔ ڈرائیو کو کہو گا رکھالے۔ میں اس کو ہسپتال لے کر جاؤں گا۔“

وجاہت سومرو بھی فکر مند ہو گیا۔ تیز تیز قدموں سے چلتا وہ باہر آیا تھا اور ڈرائیو سے اپنی گاڑی باہر نکلائی تھی۔ پیچھے پیچھے شانزل چلا آیا تھا، بہت احتیاط سے دونوں بازوؤں میں بیہوش خضریٰ کو اٹھائے ہوئے۔ یہ گاؤں کسی اعلیٰ اور بہترین ہسپتال کی سہولت سے محروم تھا۔

درمیانے احاطے میں بنی تین کمروں اور چھوٹے سے صحن پر مشتمل وہ واحد ڈسپنسری تھی جہاں مجبوراً انہیں خضریٰ کو لانا پڑا تھا۔ وجاہت سومرو کو وہاں دیکھ کر الجھ سی جیج مچی تھی۔ خضریٰ کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا تھا۔

”یہ..... یہ لوگ کامیاب تو ہو جائیں گے؟؟ پچالیں گے اسے؟“ شانزل جو مسلسل بدھرا دھر چکر لگا رہا تھا، وجاہت کے قریب آ کر بولا۔

”شاید۔ اچھی امید رکھو۔ امید پر دنیا قائم ہے۔“ اس نے تسلی دی۔

”ہوں..... کتنے افسوس کی بات ہے۔ اتنے وسیع علاقے کے مالک ہو کر، بے پناہ

دولت کے وارث ہونے کے باوجود تم یہاں ایک اچھا ہاسٹل تک نہیں بٹھا سکے؟ کیا ہوتا ہو گا یہاں ہزاروں بسنے والوں کا جب وہ ایسی کسی سنگین صورتحال یا بیماری کا شکار ہو جاتے ہوں گے۔ یقیناً مر جاتے ہوں گے۔ ان کی استطاعت یہاں آ کر ختم ہو جاتی ہو گی۔ کیونکہ نہ ان کے پاس تنہائی طرح ہوا کے دوش پر اڑنے والی گاڑیاں ہیں، نہ بے پناہ دولت کا تحفظ اور نہ ہی شہروں میں بہترین و اعلیٰ شخصیات سے تعلقات استوار ہوتے ہیں۔ لعنت ہے ایسی دولت پر جو عیش و عشرت اور ہوس پرستی پر تو بے حساب نچھاور کی جائے مگر غریبوں کو ان کے انسانی حقوق سے بھی محروم رکھا جائے۔“ شانزل خان کے تاسف زدہ لہجے میں ایسی کوئی بات تھی کہ چند لمحے وجاہت سومرو نکلیں اور حد شرمندگی و ندامت کے باعث اٹھانہ سکا۔ وہ شانزل خان کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ پڑھائی کے دور کا بہت سا وقت اس نے کینیڈا میں اس کے ساتھ گزارا تھا۔ شانزل خان کھلی کتاب کی مانند تھا۔ اپنی زندگی کی کتاب کے سفید سیاہ اور ارق وہ کسی سے مخفی رکھنے کا روادار نہ تھا۔ بے شک اس میں وہ ساری خامیاں بدرجہ اتم موجود تھیں جو اس جیسے از حد مردانہ وجاہت کے ساتھ ساتھ دولت کو بے دریغ استعمال کرنے والے شخص میں موجود ہوتی ہیں اور یہ بھی حقیقت تھی کہ بہت سی لڑکیوں سے اس کی دوستی تمام حدود پار کر جاتی تھی جن میں مدنی صد خواہشات لڑکیوں کی ہوتی تھیں۔ ایک طرف اس کے کردار میں جھول تھا تو دوسری طرف غریبوں کی امداد وہ بہت فراخ دلی سے کرتا تھا۔ ظاہری وحشیہ دونوں طریقوں سے۔ کئی ٹرسٹ اور ادارے اس کے زیر سرپرستی چل رہے تھے جس کا اس نے کبھی چرچا نہیں کیا تھا۔

اس وقت اس کی تنگی بھری تاسف زدہ آواز وجاہت سومرو کو آئینہ دکھا گئی تھی۔

”سوری یار! میں تو خود کو اپنے بزرگوں سے بہت بہتر اور انصاف پسند سمجھتا تھا۔ لوگوں کو معمولی سی سہولیات دے کر مطمئن تھا کہ میں نے اپنا حق ادا کر دیا ہے۔ لیکن نہیں، اندر سے میں بھی روائی و ذریعہ نکلا۔ کم ظرف، بے احساس، مظلوم غریب لوگوں کو کپڑے کھڑے سمجھنے والا گناہ گار انسان۔“

”تمہیں معلوم ہے مجھے محض دعوے، باتیں اور وعدے کرنے والے لوگوں سے اس قدر چڑ ہے جتنی ہم کسی مردہ خور جانور سے کرتے ہیں۔ بہتر وہی لوگ ہوتے ہیں جو کہتے ہیں، وہ کرتے ہیں۔ وہ وعدوں اور بکواس میں وقت کا زیاں کرنے کی بجائے کچھ کر کے دکھاتے ہیں۔“

”او کے..... اگلی بار آؤ گے تو دیکھنا وجاہت سومرو بکواس کرنے والا ہندو ہے یا کر کے دکھانے والا۔“ اس کے لہجے میں نئے عزم و ولولے کا جوش تھا۔

اسی وقت اندر سے ادیز عمر ڈاکٹر اور لیڈی ڈاکٹر دوترسوں کے ہمراہ باہر آئے۔ ”مبارک ہو سائیں! خطرہ ٹل گیا ہے۔ مرینہ اب بالکل ٹھیک ہے۔“ ڈاکٹر نے وجاہت سومرو کے قریب آتے ہوئے پُر جوش لہجے میں کہا۔

”اوو، ٹھیکس گاڈ.....“ وہ بے اختیار اندر چلا آیا۔

خفزی آنکھیں بند کئے بیڈ پر لیٹی تھی۔ دائیں ہاتھ میں ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ نامعلوم دوائیوں کے زیر اثر سورہی تھی یا اسے دیکھ کر آنکھیں بند کئے لیٹی تھی۔ وہ بیڈ کے قریب کھڑا اسے ایک تک دیکھ گیا۔ اس کے زرد چہرے پر ستواں کھڑی ٹاک، سیاہ بھوڑا جیسی پلکیں بہت نمایاں ہو رہی تھیں۔

”خفزی!..... خفزی!“ اس نے جھک کر دھیرے دھیرے پکارا مگر اس میں کوئی جنبش بھی نہ ہوئی تو وہ وہیں بیٹھ کر اس کا دوسرا ہاتھ پکڑ کر گویا ہوا۔

”اب..... کیسی طبیعت.....“

”چھوڑو..... میرا ہاتھ چھوڑو۔“ جملہ مکمل ہونے سے قبل ہی وہ آنکھیں کھول کر چیخی۔ شانزل خان نے فوراً ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ اس کی لرزتی پلکیوں کی جنبش سے سمجھ گیا تھا کہ وہ جان کر آنکھیں بند کئے پڑی ہے۔ اسے حرکت میں لانے کے لئے اس نے ہاتھ پکڑا تھا جس کا نتیجہ سو فیصد درست نکلا تھا۔

”ناراض مت ہو، میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ طبیعت کیسی ہے؟ کیا کر لیا تھا؟“

”شکر کیجئے سائیں، کچھ تو زیادہ زہر ملا نہیں تھا۔“ وجاہت سومرو کے ہمراہ اندر آتے

ڈاکٹر کی گفتگو سن کر وہ چونک کر بولا۔

”کیا انہیں بچھونے کا تھا؟“

”جی ہاں۔ خوش نصیبی ہے نیگم صاحبہ کی کہ وہ بچھو معمولی سا زہریلا تھا ورنہ اس علاقے میں تو اتنے خطرناک سانپ بچھو موجود ہیں کہ ان کا کاٹنا پانی نہیں مانگتا۔ لمحوں میں آدمی جان دے دیتا ہے۔“ ڈاکٹر، ڈیرے اور اس کے دوست کو یہاں دیکھ کر از حد مرعوب ہوا تھا کیونکہ وجاہت سومرو سے وہ واقف تھا اور شانزل کی شاندار وبا رعب شخصیت سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کسی طور پر وجاہت سومرو سے کم حیثیت کا مالک نہیں ہے۔ ان کے لئے اس نے اپنی طرف سے ڈپنسری کے پیچھے بنے اپنے گھر میں پُر تکلف چائے کا اہتمام کر ڈالا تھا اور اب بہت اصرار سے انہیں دعوت دے رہا تھا۔

”نہیں ڈاکٹر صاحب! آپ کی بے حد مہربانی ہے کہ آپ نے ہماری مہمان کی جان بچائی۔ چائے وغیرہ کا تکلف چھوڑیں۔ ہم حویلی جا کر چائے پیئیں گے۔“ وجاہت سومرو نے کہا۔

”مہربانی تو اللہ کی ہے سائیں۔ اس نے آپ کے ساتھ میری بھی لاج رکھ لی۔ آپ اپنے مہمانوں کو لے کر غریب خانے پر چائے پی لیں گے تو عزت افزائی ہوگی مجھے حقیر بندے کی۔“ ڈاکٹر پُر خلوص اور مہمان نواز تھا۔ اس کے لہجے سے کوئی غرض و خوشامد نہیں جھلک رہی تھی۔ وجاہت سومرو کے دوبارہ انکار کرنے سے قہر وہ بول اٹھا۔

”ان کی ڈرپ ختم ہو جائے ڈاکٹر صاحب تو ہم ضرور آئیں گے۔ یہ ہمارے لئے سعادت و مسرت کی بات ہے کہ آپ جیسے نیک اور انسانیت کی خدمت کرنے والے عظیم انسان سے ملاقات کا شرف نصیب ہو رہا ہے۔“ شانزل کے ان تحسین آمیز الفاظ نے ڈاکٹر کے چہرے پر چراغ سے روشن کر دیے تو وہ شکر یہ کہتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

”مجھے غلامت سمجھتا۔ میں نے اسی لئے انکار کیا تھا کہ کہیں تم پرانہ مان جاؤ کہ

ایک اونٹنی ڈاکٹر کی دعوت میں نے قبول کر لی۔“ ڈاکٹر کے باہر جاتے ہی وجاہت سومرو بولا۔

”ایک عرصہ سنگ رہنے کے باوجود تم میری نیچر کوٹ کچھ پائے۔ اب سوائے حریت و افسوس کے کیا کر سکتا ہوں۔“ شانزل نے سنجیدگی سے کہا۔

دن داخل رہا تھا۔ شام کے سرسبز سائے دور افق کے کناروں پر پھیل رہے تھے۔ خطرہ کی طبیعت اب بہتر تھی مگر اس کی بیزاری و خاموشی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

”پلیز دی! اب اصرار نہ کرنا۔ میں نے تمہیں کہا تھا نا اگر ایک بار کوئی ارادہ کر لوں تو اس سے دستبردار ہوتا میرے لئے قلعی ناممکن ہو جاتا ہے۔ اپنی یہ عادت مجھے بھی قلعی ناپسند ہے لیکن اس قدر پختہ ہو چکی ہے کہ اسے چھوڑنا چاہتا ہوں مگر یہاں میں خود سے ہلکتا کھا جاتا ہوں۔“ باہر حویلی جانے والے راستے پر وجاہت کو کار لے جانے کا اشارہ کرتے دیکھ کر شانزل نرمی سے بولا۔

”اچھا۔ تم کبھی نہیں سدھرو گے۔ ہمیشہ اپنی ضد پوری کرتے ہو۔ ٹھیک ہے۔ لیکن جانے سے قبل وعدہ کر کے جاؤ، بہت جلد ملنے آؤ گے۔“

”کیوں، تمہارے لئے کیا وہاں نوائسری کا بورڈ آویزاں ہے؟“

”نہیں بابا! ایسا کیوں ہوگا۔ بس زمینوں کے جھگڑے ہیں جنہیں مناتے مناتے بھی کچھ عرصہ باہر نہیں نکل سکتا۔ آؤں گا، کچھ ٹروں سے غصتے ہی آؤں گا۔ ایک احسان کرو، اپنا ڈرائیور ایک ہفتے کے لئے مجھے دے دو۔ بڑے کام ہیں مجھے۔ میرے دونوں ہی ڈرائیور بیمار پڑے ہیں۔“ وجاہت سومرو نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

”یہ کوئی احسان کی بات نہیں ہے۔ نور محمد حویلی میں ہی ہے۔ روکھ لینا اسے جب تک تمہارا کام نہیں ہو جاتا۔ میرے پاس بندے اور بھی ہیں۔“ شانزل خان نے فراخ دلی کا مظاہرہ کیا۔ دونوں دوست گلے ملے، کچھ رسمی باتیں ہوئیں پھر وہ دونوں ایک دوسرے کو الوداع کہتے اپنی اپنی گاڑیوں کی طرف بڑھ گئے۔ وجاہت سومرو اس وقت تک ہاتھ میں پکڑا ہوا مال ہلاتا رہا جب تک ان کی کارنگ ہوں سے اوٹھل نہ ہو گئی۔

”اؤ کے۔ تو مجھ پر بھی کسی کی دھوئیں نہیں چل سکتی۔“ اس نے کار روک دی۔
 ”یہ..... یہ کیا مقصد ہے؟“ اسے کار روکتے دیکھ کر وہ بوکھلا گئی۔

”کار تپ چلے گی جب آپ فرنٹ سیٹ پر بیٹھیں گی ورنہ میرے لئے کوئی مشکل نہیں ہے اس طرح بیٹھے بیٹھے نہیں رات گزار دیتا۔“

”خواہ مخواہ کی ضد کر رہے ہیں آپ۔“ خضرئی نے شدید غصے سے کہا تھا۔ شانزل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا اور یونٹ پر بیٹھ کر باہر اچھڑا پڑا وہی سے دیکھنے لگا۔

شام کا گلابی آئین ہر سو پھیلا ہوا تھا۔ رخصت ہوتے سورج کی ستہری کرنیں اپنے روپ کا سونا خوب لٹا رہی تھیں۔ شہر کی آلودگی سے پاک فضا میں محسوس کی جانے والی تازگی و لطافت تھی۔ ارد گرد رکھت پھیلے ہوئے تھے جن میں چھوٹے چھوٹے پیلے بھول کھلے ہوئے تھے۔

گھاؤں کے کچے گھروں سے اٹھتی تازہ پکٹی مکی کی روٹی اور ساگ کی خوشبو ہواؤں میں پھیلی ہوئی تھی۔ یہ خوشبو نہیں اتنی اشتہا انگیز تھیں کہ اسے محسوس ہوا کہ بڑی شدت سے بھوک لگ رہی ہے۔ رات بھی اس نے برائے نام کھایا تھا اور اب صبح سے کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔ چائے پر شانزل کے علاوہ ڈاکٹر، اس کی وائف اور وہاں سہروٹے انے از حد اصرار کیا تھا لیکن اس کی سر دھری و خاموشی کے آگے وہ خاموش ہو گئے تھے اور اسے ان کی رتی بھر پرواہ نہیں تھی۔

آدھا گھنٹہ گزر چکا تھا ان دونوں کو اپنی فضول مندوں میں متعید ہوئے۔

”آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟“ وقت تیزی سے گزرتا دیکھ کر بالآخر اسے کہنا پڑا۔

”صرف کچھ وقت۔ حسین لکھن کی قربت کا تمنائی ہوں۔“ اس نے جھک کر ذہنی لہجے میں کہا۔ اس کی سرخ سرخ سحر انگیز نگاہوں میں وہی وحشیانہ چمک ابھر آئی تھی جس کے پہلی مرتبہ اس کے چہرے پر پڑتے ہی لاشعور میں کوئی انجانا سا خوف کھڑی مار کر بیٹھ گیا تھا جواب اس کے لئے امتحان بن کر سر پر سوار ہو چکا تھا۔

شام کی جانب بڑھتے سايوں میں گاؤں کے مناظر و کش، سرسبز و شاداب سبزی کی مانند لگ رہے تھے۔ وہ سستی خواہش مند تھی ایسے حسین اور قدرت سے قریب تر کر دینے والے نگارے دیکھنے کی۔ اب خواہش مکمل ہوئی بھی تو بد مزہ تھی۔

خواہشات کا وجود بھی عجیب ہے۔ ذہن میں اس طرح آگ آتی ہیں جیسے خود رو پودے بے طلب ہی زندگی پالیتے ہیں لیکن ان کی جڑیں خواہشوں کے پودوں کے مقابلے میں بہت طاقتور و مضبوط نہیں ہوتی ہیں۔ خود رو پودوں کو ایک ہی جھٹکے میں جڑوں سمیت اکھاڑ کر پھینک دیا جاتا ہے اور ان خواہشوں کی جڑیں تو انسان کو آکاس نیلوں کی مانند بکڑ لیتی ہیں۔ انسانی وجود ہی خواہشوں کی بنیاد ہے شاید، جیسی تربیت کے ہر لمحے میں خواہشیں سکڑی کے چالوں کی مانند ہم سے لپٹی نظر آتی ہیں۔ ایک پوری ہو جائے تو دوسری، تیسری، چارویں سانس تک ساتھ دیتی ہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض خواہشیں جو بڑی زور آور ہوتی ہیں، جن کے پورا ہونے کا ہم انتظار کرتے ہیں، وہ اگر قسمت سے کبھی پوری ہو بھی جائیں تو اذیت ناک بن جاتی ہیں۔ جیسا اب اس کے ساتھ ہو رہا تھا۔

”ایک سیکورٹی۔“ وہ نہ جانے کب سے پکار رہا تھا۔ اب کار ڈرائیو کرتے کرتے لمحے بھر کو اس کی جانب دیکھ کر بولا تو وہ ڈرائیو چوکی تھی۔ جواب تو اسے کچھ نہیں دیا، صرف ایک نگاہ اس کی جانب دیکھ کر دوبارہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

”آگے آجائیے۔ مجھ سے تھما بیٹھ کر ڈرائیو تک نہیں ہوتی۔“ بہت فراخ دلی سے اس کی ناگواری نظر انداز کر کے وہ پیش لہجے میں گویا ہوا۔

”میں آپ کی کسی بھی فضول عادت کو جاننا نہیں چاہتی اور نہ ہی پورا کرنے کی پابند ہوں۔ سمجھے؟“ وہ اس کی جانب دیکھے بغیر سخت لہجے میں بولی۔

”میں آپ کا ڈرائیو نہیں مخترمہ اکم آن۔“ اس کا لہجہ تھکی تھا۔

”مجھے کوئی مجبور نہیں کر سکتا۔“

”میرا مطلب ہے آگے آکر بیٹھ جاؤ۔“ خضرنی کے چہرے کے بدلتے رنگ دیکھ کر اس نے مسکراتے ہوئے بات بدلی تھی۔

اس کی ہٹ دھرمی خنصری کو اپنی بے بسی و مجبوری کا مکمل احساس دلانے لگی۔ وہ غاموشی سے پچھلی سیٹ سے اٹھ کر فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی۔

”بہت بہت شکریہ۔“ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے وہ شوقی سے ہللا۔

وہ خاموشی سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ خضر کی دروازے کے ساتھ چپک کر بیٹھی تھی، گویا اس نے چھوٹے کی بھی کوشش کی تو وہ دروازہ کھول کر باہر کود جائے گی۔

وقت کی رفتار کار کی رفتار سے زیادہ تیز تھی۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ شام کی گھلائی رگت رات کی سیاہی میں بدل چکی تھی۔ دنیا کی روشنی میں جگہوں کو سرشار کر دیئے والا سبز و اب تارکی میں ڈوبا اتنا ہی خوفناک لگ رہا تھا کہ اس پر نگاہ ڈالنے کو بھی دل نہ چاہ رہا تھا۔

اُس نے کھلائی پر بندھی نواج میں ٹانگ دیکھا تو حیرانی سے گویا ہوئی۔

”کیا واقعی آنکھ بجے ہیں؟“

“میں نے سنا ہے کہ آپ نے ایک نیا کتاب لکھی ہے۔“

”لیکن یہاں تو ایسا لگ رہا ہے جیسے آدھی رات گزر چکی ہو۔“

”یہ گاؤں ہے۔ غیر ترقی یافتہ اور پسماندگی کا شکار۔ بکلی اور گھیس جیسی ضروری ضروریات ابھی یہاں میسر نہ ہو سکی ہیں۔ شہروں کی چمکا چمکاؤں میں تو اس وقت ڈھنگ سے رات بھی شروع نہیں ہوتی لیکن ایسے دیہاتوں کے لوگ کم از کم میرے خیال سے تو خوش نصیب ہیں کہ اس دور میں بہت صاف و شفاف آب و ہوا میں سانس لے رہے ہیں جو ہم لوگوں کے لئے صرف خواب بن گئی ہے۔ کتنا فطرت سے قریب ہیں یہ لوگ۔ سادہ زندگی، سادہ ماحول، محمود نمائش سے پاک لوگ جو صبح سورج نکلنے سے پہلے جاگ جاتے ہیں اور سورج ڈوبنے کے بعد جن کی رات شروع ہو جاتی ہے۔ ہم سے بہتر ہیں یہ لوگ، وقت کی قدر کرنے والے، جو وقت کے پیچھے نہیں بلکہ وقت جن

کے پیچھے چلا ہے۔" شانزل کے لہجے میں یہاں کے لوگوں کے لئے ستائش تھی۔ جب وہ ایسی باتیں کرتا تھا تو کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ایک خراب شخص ہے کیونکہ بظاہر وہ بہت زبردست پرستانی رکھتا تھا۔ نرم خو، خوش اخلاق، لوگوں سے ملنے وقت وہ امیر غریبی کا فرق بالکل مٹا دیا کرتا تھا۔ اپنی امارت کے حوالے سے اس میں دلی بھر بھی غرور و تکبر نہ تھا۔

”شانزدل خان! کاش تم ایک بدکردار شخص نہ ہوتے تو مستہر کبھی جاتے۔“ اس کی باتوں سے مستہر ہو کر اس نے دل میں سوچا۔

”اوہ..... ہنر دل چیک کرنا تو مجھے یاد ہی نہیں رہا۔“

”کیا..... پھر ول ختم ہو گیا؟“

”ہاں۔“ شانزل کے لہجے میں پریشانی محسوس کر کے وہ خود بھی پریشان ہو گئی۔
”اب کیا ہو گا؟ پٹرول کہاں سے ملے گا؟ میں نے تو یہاں کوئی پٹرول شاپ دیکھی

نہیں۔ اور اندھیرا بھی اس قدر ہے۔"

”کھبراؤ نہیں۔ کوئی نہ کوئی ہندو بست کرتا ہوں۔“ اُسے پریشان اور کھبرایا ہوا دیکھ کر اس نے غم لہجے میں تسلی دی۔

”یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ تمہارے اندر جو ایسی شیطیت اور ہوس کی وجہ سے نامعلوم قسم جیسے کم ظرف و بے ضمیر لوگوں کو اوپر والا اتنا کیوں نواز دیتا ہے کہ تم لوگ آپے سے باہر ہو کر خود کو خدا سمجھنے لگتے ہو۔ اور خدائی کے دعوے کرنے والے شیطانوں کے عبرت خاک انجام سے باخبر ہونے کے باوجود نفس کے گھوڑے پر دوڑتے رہتے ہو۔ بدکار لوگ۔“ خضرؑ کی لہجہ میں وہی بے پناہ نفرت و حقارت سمٹ آئی تھی جو شانزل کی رگ رگ میں تبدیل و تحقیر کے افکار سے وہ نکا دیا کرتی تھی۔

”مختصر فی حیات! حد میں رہو اپنی۔“

”کیا تمہارے لئے کوئی حد متعین نہیں ہے؟“

”کیا کیا ہے میں نے؟ کون سی عداوت کی ہے؟“ و زیادہ دیر اپنے درشت لمبے پر کاہتہ پاسکا۔

”اوجھ..... کیا کیا ہے میں نے۔ تمہارے پاس منیر ہی کہاں ہے جو معلوم کر سکو کہ کیا کیا ہے تم نے؟“ وہ غصے سے شانزل کے الفاظ دہرا کر بولی۔

”وہ اچھا۔ شاید تمہیں اپنا مسیبت یاد آ رہا ہے۔ تم اس سے اسی طرح لڑتی ہو گی۔ تب ہی...“

”شٹ اپ۔“

”خیر مائیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں، بلکہ خوشی ہے کہ اسی حساب سے میرے لئے تھوڑی گنجائش اور نکال لو۔ یعنی لڑائی کے بعد پیادہ کا مرحلہ.....“

”تم..... تم..... آگے ایک لفظ بھی کہا تم نے تو میں تمہارا منہ توجہ لوں گی۔“

”اوکے..... اوکے، ریلیکس۔ یہ لڑائی اور پیادہ کے مرحلے تو ہم بعد میں طے کریں گے۔ پہلے یہ مسئلہ تو حل ہو کہ اب کیا کرنا ہے؟“ اس کی آنکھوں میں شوخی اور لبوں پر ہر پور مسکراہٹ تھی۔ گویا وہ اس کے غصے سے از حد انجوائے کر رہا ہو۔

خضریٰ نے کچھ نہیں کہا لیکن دل ہی دل میں اسے خوب کوسنوں سے نواز رہی تھی۔

شانزل کا سر سے نکل کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ دونوں اطراف نہ معلوم کس چیز کے

کھیت تھے جن کی اونچائی کے باعث کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ انہیں دیکھ کر صرف اور صرف

گھبراہٹ جیسے کا احساس ہو رہا تھا کیونکہ ان کی کار درمیان سڑک پر تھی جس کے دونوں

جانب ان کھیتوں کا سلسلہ بہت آگے تک چلا گیا تھا۔

وہ دانت بچھنے شانزل کو دیکھ رہی تھی جو نہایت اطمینان سے تھوڑا سا جائزہ لے کر

سیت پر بیٹھ گیا تھا۔

”کیا رات اسی طرح گزرے گی؟“

”نہیں..... اگر تم چاہو تو بہت خوشگوار گزر سکتی ہے۔“ اس کے ہونٹوں پر پھر مسی خیر

مسکراہٹ ابھرتی تھی۔

”تم بھی حسرت دل میں لے کر مر جاؤ گے۔ تم مجھے تو کیا میری پرچھائیں کو بھی نہیں پاسکتے۔ سمجھے؟“

”چینج کر رہی ہو؟“ اس نے جھک کر اس کی نگاہوں میں جھانکا۔

”جو سمجھو۔“ اس کے جیسے ہوش دھاس متعل ہو گئے تھے۔

”جہیں گھمنڈ کس بات پر ہے؟ کیا سمجھتی ہو خود کو؟“ اس کے لمبے میں چنگاریاں

سنگ رہی تھیں۔ مزید اس کے کہ بات بڑھتی، لمحہ بھر میں اس نے ابھرتے غصے پر قابو پا

لیا۔ دوسرے لمحے وہ بہت پرسکون اور مطمئن نظر آ رہا تھا، گویا ان کے درمیان کوئی بد مزگی

ہوئی ہی نہ ہو۔ یہی خصوصیت اس کے شاطر اور خطرناک ہونے کی دلیل تھی۔ دشمن وہی

زیادہ خطرناک ہوتا ہے جو ٹھنڈا مزاج رکھتا ہو اور جذبات پر قابو رکھنا جانتا ہو۔ وہ اسی

فطرت کا مالک تھا۔

”ہر وقت غصے میں رہنا بری بات ہوتی ہے۔ فی الحال یہاں اندر ٹھنکی رہنا، میں ذرا

آگے جاتا ہوں، دیکھتا ہوں کیا صورتحال ہے۔ دوبارہ وہی بے وقوفی مت کرنا جو

وجاہت سومرو کے ہاں کر چکی ہو۔ وہاں ہر طرف رات میں اسپرے ہوتا ہے، اس کے

باوجود تم بچھوکا شکار ہو گئی تھیں۔ یہاں یقیناً سانپ، بچھوؤں کے علاوہ اور بھی زہریلے

کینڑے ہو سکتے ہیں۔“ اس نے ڈرائیونگ ڈور کھولنے سے قبل اسے سمجھا دیا تھا۔

وہ چلا گیا تو خضریٰ نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔

شانزل تیزی سے آگے کی سمت جا رہا تھا۔ بے اختیار وہ اسے جاتے ہوئے دیکھ

رہی تھی۔ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا وہ دائیں جانب مڑ کر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو

اس نے ارد گرد دیکھا اور کھیتوں میں پھیلی تاریکی نے اسے خوفزدہ کر دیا۔ وہ کیسا بھی تھا

لیکن اس کی موجودگی میں تنہائی کا خوف نہیں تھا۔ اس نے تیزی سے کھڑکی کے شیشے

پر حائے اور نگاہیں جھکا کر بیٹھ گئی اس ارادے سے کہ اب باہر نہیں دیکھے گی۔ مگر سوج

کے برخلاف بے ساختہ اس کی نگاہیں باہر اٹھ رہی تھیں۔

ہواؤں کے زور سے کھیتوں میں ہونے والی سرسراہٹیں بھی اسے بڑی پراسرار لگ

رہی تھیں اور دل سوکھے سچے کی مانند کانپ اٹھتا تھا۔

کچھ دیر بعد شانزل ایک شخص کے ہمراہ آتا ہوا نظر آیا تو اس کی جان میں جان آئی۔
 ”آ جاؤ باہر۔ شکر کرو یہ نیک فرشتہ اتفاقاً پڑھائی کرتا ہوا مل گیا۔ ورنہ یہاں کے
 لوگ تو لگتا ہے نورج کے ساتھ ہی تیندی آغوش میں چلے جاتے ہیں۔“ شانزل فرمت
 ڈور کھول کر اس سے مخاطب ہوا تو وہ بھی کانپتی ہوئی باہر نکل آئی۔ شانزل کارلاک
 کرنے لگا۔ خضریٰ نے ہنستی ہوئی نگاہ دوسرے شخص پر ڈالی۔ وہ سترہ اٹھارہ سالہ
 نوجوان تھا جس کے چہرے پر معصومیت اور بھوک تھی۔ وہ نگاہیں جھکائے سو وہ سا
 کھڑا تھا۔

”چلو۔“ وہ کارلاک کر کے آیا تو بولا۔ کار کی بیڈ لائٹس بند ہو جانے کی وجہ سے
 وہاں یکدم اندھیرا چھا گیا تھا۔ صرف نیلے آکاش پر چمکتے چاند کی شینل چاندنی تھی جو
 وہاں بکھری ہوئی تھی جس سے عجب طلسماتی سحر انگیز ماحول نور ہا تھا۔
 ”ہاتھ تمام لو میرا۔ راستہ خراب ہے، کہیں گر نہ جاؤ۔“ خضریٰ کو کئی دفعہ ٹھوکر ماریں
 کھاتے دیکھ کر اس نے ہوردی سے کہا۔

”بے فکر رہو۔ کم از کم آپ کے سامنے تو میں ہرگز نہیں گر سکتی۔“
 ”اوکے، جیسی تمہاری مرضی۔“ وہ شانے اچکا کر لا پرواہی سے گویا ہوا اور اس
 نوجوان کے ساتھ باتیں کرتا چلے لگا۔

لیکھت کھیتوں میں سرسراہٹ ہوئی تھی۔ اس نے دیکھا تو خوف و دہشت سے
 آنکھیں پھٹ گئیں۔ دو لمبے بازو قد میں دائیں بائیں پھیلائے ایک بے تحاشا لمبا وجود
 کسی دوسری مخلوق کا تھا جس کے چہرے کے خدو خال اتنے ہی بے بسیا تک تھے کہ اس کی
 بے ساختہ چیخ نکل کر خاموشیوں میں ارتعاش پیدا کر گئی۔

”کیا ہوا..... کیا ہوئے؟“ وہ دونوں جو اس سے چند قدم کے فاصلے پر چل رہے تھے،
 چیخ مں کر برق رفتاری سے اس کی طرف آکر پوچھنے لگے۔
 ”وو..... وو.....“ مارے دہشت کے اس کے لبوں سے آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔

”کون ہے؟ کس سے خوفزدہ ہو گئیں؟“ شانزل اس کے کانپتے وجود کو دیکھ کر نرمی
 سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر گویا ہوا۔

”وو..... وہ کیا ہے؟“ اس نے ہاتھ کے اشارے سے اس عجیب و غریب مخلوق کی
 طرف اشارہ کیا۔ اس کے ہاتھ کے اشارے پر دونوں نے دیکھا۔

”وو..... وہ تو جی اشیو ہے۔ دراصل فصل تیار ہو جاتی ہے تو پرندے خراب کر دیتے
 ہیں۔ پرندوں کو خوفزدہ کرنے کے لئے ایسے اشیو بنائے جاتے ہیں۔ پرندے انہیں
 انسان سمجھتے ہیں اور فصل سے دور رہتے ہیں۔“ اس نوجوان نے سادگی سے معلومات
 فراہم کیں تو وہ اپنی بیوقوفی پر از حد شرمسار ہو گئی۔ شانزل قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔

”واوا کیا خوب بنایا ہے بنانے والے نے۔ جب اس بانس کے بنے ہوئے
 انسان کو دیکھ کر انسان ہی ذور رہا ہے تو پیارے پرندے تو دور سے ہی بھاگ جاتے
 ہوں گے۔“ اس نوجوان نے کوئی جواب نہیں دیا تھا بلکہ اسے مسکراتے ہوئے وہ دیکھ
 چکی تھی۔

ایک چھوٹے کمرے اور وسیع کھلے محن والے گھر میں لائٹیں کی زرد روشنی پھیلی
 ہوئی تھی۔ اس لڑکے نے جس کا نام منور تھا اور اس کی ماں نے ان دونوں کا بہت گرم
 جوشی سے استقبال کیا تھا۔ پرائے، آم کا اچار اور بھنے تیلے سے ان کی خاطر مدارات
 کی تھی۔

اس نے سیر ہو کر کھانا کھایا تھا۔ بھوک کتنی خالم چیز ہوتی ہے۔ اسے پہلی دفعہ
 احساس ہوا تھا کہ کس طرح بھوک سے مجبور ہو کر لوگ کوزے سے اٹھا کر روٹی کھا لیتے
 ہیں۔ پیٹ کی آگ بجھانے کی خاطر ہی تو لوگ نہ جانے کیسی کیسی آگ میں جلتے ہیں۔

”معاف کرنا صاحب، ہم غریب لوگ ہیں۔ آپ لوگوں کی خدمت و خدمت سے نہ
 کر سکیں گے۔ جو اللہ نے دیا ہے سب آپ کے لئے حاضر ہے۔“ کھانے سے فارغ
 ہوئے تو منور کی ماں ان سے عاجزانہ لہجہ میں بولی۔

”آپ ہمیں شرمندہ کر رہی ہیں ماں مٹی۔ یہ تو آپ کا غلوں اور مہربانی ہے کہ آپ

نے وہ انہیوں کو اپنے گھر میں ٹھہرنے کی اجازت دی، ہماری خاطر داری کی، ورنہ اس دور میں کہاں ایسی مروت و اپنائیت زندہ رہی ہے۔ لوگ اپنوں سے کتراتے ہیں، بھلا انہیوں کے لئے کہاں گنجائش ہوتی ہے۔ گھر میں نہ دل میں، باہر سے ہی فارغ کر دیا جاتا ہے۔" شانزل کے لہجے میں حقیقی خلوص تھا۔

"مہمان تو اللہ کی رحمت ہوتے ہیں۔ منور نے مجھے جب بتایا کہ شہر سے گاڑی آکر یہاں رُک گئی ہے تیل ختم ہونے کی وجہ سے تو میں نے جیسی اس سے کہہ دیا تھا کہ جا کر مہمانوں کو لے آئے۔ کیونکہ یہاں کوئی ہوٹل نہیں ہے اور گھر بھی بہت کم ہیں۔"

"چلے صاحب! بستر لگا دیئے ہیں۔" منور نے آکر اطلاع دی تو وہ اٹھ گئے۔ صحن کے درمیان میں چار پانگ بچے ہوئے تھے۔ پہلے پر منور لیٹ گیا تھا، دوسرے پر اس کی ماں، تیسرا چنگ خالی تھا، چوتھے پر شانزل دروازہ تھا۔ چاروں چنگ ترتیب سے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بچے ہوئے تھے لیکن تھے ایک ہی لائن میں۔

"کب تک سوچتی رہو گی؟ لیٹ جاؤ آکر۔" اُسے بت بنے دیکھ کر شانزل کو کہنا پڑا۔

"یہ کون سا طریقہ ہے سونے کا؟" وہ جھنجھلا کر بولی۔

"بہت باوقار و شریفانہ طریقہ ہے۔"

"میں اس طرح نہیں سو سکتی۔"

"پلیز ہر وقت صرف اپنے متعلق نہیں سوچتی رہا کرو۔ تمہاری "میں" سے بہت چڑ ہے مجھے۔ کم آن، مست ٹنک کر دان سیدھے سادھے مہمان نواز لوگوں کو، ان کی تحن کا احساس نہیں ہے تمہیں۔ دیکھو لینے ہی بے خبر ہو گئے ہیں۔"

منور کی ماں کے خزانے صحن میں گونجنے لگے تھے۔ وہ خاموشی سے آکر سر سے پاؤں تک تکیں لپیٹ کر لیٹ گئی۔ شانزل پہلے ہی اپنے چنگ پر دروازہ تھا۔

دھیرے دھیرے چلتی ہواؤں کے جھونکوں میں ہلکی ہلکی نمی تھی۔ سامنے کمرے کے دروازے کے پاس گلی موٹی سی کیل پر لائین لگی ہوئی تھی جس کی روشنی ہم بدیم جیسی پڑتی

جا رہی تھی۔ نیم تاریکی اور چاند کی روشنی میں اُسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی قدیم دور میں داخل ہو گئی ہو۔

سیاہ آسمان پر چاند اور ستارے اتنے روشن و شفاف تھے کہ ان کی روشنی و ظلماتی حسن سے نگاہیں خیرہ ہو رہی تھیں۔ اُس نے اپنی زندگی میں پہلی بار اتنا خوبصورت آسمان دیکھا تھا۔ شہروں میں فضا کی آلودگی نے ایسے حسین نظارے ہم سے چھین لئے ہیں، ایئر کنڈیشن روٹر میں بھی وہ سکون و راحت محسوس نہیں ہوتی جو اس وقت اس کی آنکھوں سے بنے معمولی سے گھر کے صحن میں محسوس ہو رہی تھی۔

ابتدا روشن، نگاہوں کو ٹھنڈک پہنچاتا چاند، اس کے اطراف پھیلے تاجدار کا دستاروں کی چمک ہیروں کو بھی مات دے رہی تھی۔ اس لمحے وہ سب بھول کر ماحول کے حسن میں کھو گئی تھی۔ ہر طرف سکون ہی سکون تھا۔ چاندنی کا غبار عجب فسون خیز تھا۔

"ستاروں کی کتنی رہنے دو۔ آج تک کوئی اتنا چمکس پیدا نہیں ہوا جو انہیں اچھی طرح گن سکے۔ رات گہری ہو رہی ہے، پلیز سو جاؤ۔ مجھے بھی نیند آرہی ہے۔" منو تاریکی میں شانزل کی نیند سے بوجھل آواز ابھری۔ اُس نے چونک کر دیکھا۔ وہ تو اُسے سوتا ہوا سمجھ رہی تھی مگر وہ آنکھیں بند کئے لیٹا تھا۔

"مجھے اب جی بجبوں پر نیند نہیں آتی۔"

"وہم ہے تمہارا۔ نیند تو وہ ظالم شے ہے جو سولی پر بھی آ جاتی ہے، پھر یہاں تو ماحول ہی بہت سحر انگیز ہے۔" اس کی بھاری آواز گونجی۔

"آپ سو جائیں مجھے جب نیند آئے گی، سو جاؤں گی۔"

"شاید مجھ سے خوفزدہ ہو۔ فی الحال ایسے کسی خوف کو دل میں جگہ نہ دو۔ شاباش ہو جاؤ۔ ابھی آگے لیا سفر کرنا ہے۔ نیند پوری نہ ہوئی تو طبیعت پر کس قدری چھائی رہے گی۔" اس وقت اُس کا لہجہ بہت پر خلوص اور مکاری سے پاک تھا۔

"آپ مجھے گھر چھوڑ دیں۔ میں آپ کا یہ احسان ہمیشہ یاد رکھوں گی۔" اسے انسانیت کے لبادے میں دیکھ کر خطر کی ممنونیت سے بولی کہ جان بچی تھی وہ اکثر اور

دخول سے کبھی کوئی بات نہیں مانتے گا چاہے اس میں اپنا کتنا ہی نقصان کر بیٹھے۔ سو اسے راہ راست پر لانے کی خاطر اس نے اپنے رویے میں تبدیلی ناگزیر تھی۔

”اچھا ٹھیک ہے۔ مگر یاد رکھنا، احسان کا بدلہ احسان ہوتا ہے۔“

گاوؤں کی صبح بہت خوب صورت تھی۔

قراچی انڈوں اور دیکسی گھی سے تریتر پراخوں سے ناشتہ کیا گیا۔ شانزل ان ماں بیٹے سے بہت مکمل مل گیا تھا۔ حالات اس کے موافق ہوتے تو وہ بھی ان کے غلوں و مروت کا اظہار زور و شور سے کرتی۔ اس وقت تو صرف دل ہی دل میں مترف تھی۔

ناشتے کے بعد منور کی ماں نے دو بار انہیں چائے بنا کر دی تھی۔ چائے عمدہ تھی۔ شانزل کی تعریف کے جواب میں بولی۔

”منور شہر پڑھنے گیا تو یہ لت لگا کر لایا۔ اب تو میں بھی چائے کی عادی ہو گئی ہوں۔ ان دنوں چھینوں میں منور گھر آیا ہوا ہے۔“

اس کی سنجیدگی اور خاموشی کو منور نے بوریٹ سے تعبیر کیا تھا، سو اسے بہلانے کے لئے بہت سے رسالے لا کر دیئے تھے۔ وہ ان سے کچھ دور بیٹھی رسالے دیکھ رہی تھی۔ بلا ارادہ اس کی نگاہ سامنے اٹھی تو منور کی ماں بڑی ترس کھائی، ہمدردان نظروں سے اس کی جانب گاہے بگاہے دیکھ رہی تھی اور شانزل خان ان سے باتیں کرتے ہوئے بہت فکر مند و رنجیدہ لگ رہا تھا۔ نہ معلوم اسے اس کا یہ انداز از حد معنی خیز و پراسرار کیوں لگ رہا تھا۔

”آپ شہر سے آئی ہو، یہاں دل تو نہیں لگ رہا ہو گا۔“ شانزل منور کے ساتھ باہر نکلا تو وہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔

”جی، ایسی بات نہیں ہے۔ گاوؤں شہر کے مقابلے میں بہت بڑے سکون جگہ ہے۔“ رسالے ایک طرف رکھ کر وہ قصداً مسکرا کر گویا ہوئی۔

”پھر اتنی خاموشی اور پریشان کیوں لگ رہی ہو؟“

”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

”اس طرح الگ تھلک، خاموش رہو گی تو طبیعت بہلنے کی بجائے مزید خراب ہو گی۔ دیکھو بی بی! عمر میں، میں آپ سے بہت بڑی ہوں اور حیثیت تو خاک کے ذرے کے برابر بھی نہیں ہے، لیکن برائیاں مانو تو کچھ باتیں بھلائی کی ضرورت ہواؤں گی۔ اس دور میں کوئی بھی مرد اتنا بلند حوصلہ و ہمت نہیں رکھتا جتنا میں شانزل صاحب میں دیکھ رہی ہوں۔ عورت تو مرد کے تیور و مزاج دیکھ کر چلتی ہے، پھر بھی اتنی عزت نہیں پاتی۔ بہت اچھی قسمت والی ہو آپ بی بی! جو ایسا خیال رکھنے والا، چاہنے والا گھر والا ملا ہے۔“

”گھر والا؟“ اس نے حیرانی سے ان کے لفظوں پر غور کیا۔

”میں بھی دیکھ رہی ہوں، کل سے آپ نے ابھی تک ان سے کوئی بات نہیں کی ہے۔ دور دور، اکھڑی اکھڑی سی لگ رہی ہیں۔ ایسا نہیں کرتے۔ مرد تو سر کا سائیں ہوتا ہے۔ مضبوط پناہ گاہ ہوتا ہے اور ان جیسا چاہئے والا تو۔۔۔۔۔“

”کس نے کہا؟ کس نے کہا وہ میرا کچھ لگتا ہے؟“ وہ ایک دم ہی اس کی بات قبیح کر کے کھڑی ہو گئی۔ اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے کسی نے کھولتے تیل میں پانی ڈال دیا ہو۔ غصے اور جنون سے چہرہ سرخ و جسم لرزنے لگا تھا۔

”نہ۔۔۔ ناراض نہ ہو بی بی! مجھے صاحب نے ہی بتایا ہے۔“ منور کی ماں بری طرح سہم گئی۔

”وہ۔۔۔۔۔ وہ ذلیل کینہ انسان میرا کچھ نہیں لگتا۔ آوارہ، بد معاش، مجھے میری مرضی کے بغیر اغوا کر کے لایا ہے۔ میرا کوئی رشتہ نہیں اس سے۔“ ابھی تا معلوم کیا کیا وہ اسے کہتی کہ لے بھر میں وہ اندر داخل ہو کر اس کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ کر بڑے افسردہ لہجے میں ان سے مخاطب ہوا۔

”میں نے کہا تھا نا آپ سے ماں جی، انہیں دماغی دورے بھی پڑتے ہیں اور اس دوران میں یہ ایسی ہی باتیں کرتی ہیں۔ حتیٰ کہ مجھے گالیاں بکنے سے بھی نہیں چوکتیں۔“

خضر کی کوشش کے باوجود بھی اس کے ہاتھ کی سخت گرفت سے اپنے ہونٹوں کو آزاد نہ

کر پائی۔ مستزاد شانزل کا اداکاری سے بھرپور لہجہ اور ماں جی کی رحم زدہ نگاہیں۔ اس لمحے سچ سچ اس کا دل شانزل کو قتل کرنے کو بھٹنے لگا۔

”دعا کروں گی، واللہ آپ کی اس مصیبت کو اپنے کرم سے دور کرے۔ آہ.....! بھلا کوئی کہہ سکتا ہے اس قدر بیماری لڑکی ایسے موذی مرض میں مبتلا ہو سکتی ہے۔ یہ سب اوپر والے کے کھیل ہیں۔ خیر وہی مشکل آسان کرے گا۔“

”اگر ایک گلاس شند اپانی مل جائے تو.....“

”میں لاتی ہوں ابھی۔“ منور کی ماں پھرتی سے دروازے سے باہر نکل گئی تو شانزل نے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹالیا اور اس کے بچھڑے انداز کو نظر انداز کر کے بولا۔

”کچھ کہنے سے پہلے عقل بھی ذرا استعمال کر لیا کرو۔“

”آپ کو جرأت کیسے ہوئی یہ سب بکواس کرنے کی؟“ وہ بالکل آؤٹ آف کنٹرول تھی اس وقت۔

”مصلحت کے تحت کبھی ایسی بکواس کرنی پڑ جاتی ہے مائی ڈیر! یہ گاؤں کے سیدھے سادھے لوگ ماں باپ، بہن بھائی یا میاں بیوی کے علاوہ کسی چوتھے رشتے کو فاشی و بدکاری کے زمرے میں دیکھتے ہیں اور ایسے لوگوں کی پرچھائیوں سے بھی کراہت محسوس کرتے ہیں۔ ایسے میں، میں نے دانش مندی سے سوچ کچھ کر جھوٹ بولا تھا کہ اس طرح ان کی نگاہوں میں ہم دونوں کی عزت برقرار رہے۔ اگر میں تمہارے مزاج کو جانتے ہوئے یہ نہ کہتا کہ تم دماغی مریضہ ہو تو اس وقت ان کی نگاہوں سے جھٹکنے والا ترس اور اوردی نفرت و خدشات میں بدل چکی ہوتی۔ میرے ساتھ ساتھ خود کو بھی عزت و وقار سے محروم کر بیگی ہوتیں۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ جوش سے نہیں، ہوش سے کام لینا چاہئے۔“

منور کی ماں کو جگ میں پانی لاتے دیکھ کر وہ خاموش ہو گیا تو اسے بھی احسان ہوا کہ وہ کچھ غلط بھی نہیں کہہ رہا تھا۔

گاؤں سے چار پانچ کلو میٹر کے فاصلے پر ایک پٹرول پمپ تھا۔ منور سائیکل پر جا کر

پٹرول لے آیا۔

پھر واپسی کے سفر تک حضری کا سوڈا درست نہیں ہوا تھا۔ منور کی ماں نے بہت دغاؤں کے ساتھ انہیں رخصت کیا تھا۔ دونوں ماں بیٹے کافی دور تک چھوڑنے بھی آئے تھے۔

کار کا سفر ایک بار پھر شروع ہو چکا تھا۔ حضری بالکل خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ شانزل نے کئی بار دزدیدہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا بھی لیکن اس نے کوئی توجہ نہیں دی۔ گویا بالکل بیگانہ والا تعلق بنی ہوئی تھی۔

دوپہر کا وقت تھا۔ موسم ابر آلود ہونے کے باعث نضاؤں میں خشکی و خوشگواریت تھی۔ سڑک کے دونوں طرف پھیلا چاول کے کھیتوں کا سلسلہ دلکش لگ رہا تھا۔

”تاراض ہو؟ مجھے اپنے سے زیادہ تمہارا اور تمہاری عزت و وقار کا خیال تھا ورنہ مجھے ضرورت نہیں تھی یہ جھوٹ بولنے کی۔“ اس نے گویا اسے بولنے پر اکسایا۔

”کہاں جا رہے ہیں اب آپ؟“ وہ اس کی صفائی نظر انداز کر کے پوچھنے لگی۔

”گھر، یعنی کراچی۔“

”سچ؟ آپ جھوٹ تو نہیں بول رہے نا؟“

”نہیں۔ آپ نے کہا تھا، احسان کروں۔ پہلے میں آپ پر احسان کروں گا، آپ کو کراچی واپس لے جا کر۔ پھر آپ احسان کریں گی مجھ پر، کچھ وقت میرے ساتھ گزار کر۔ احسان کا بدلہ احسان ہے اور بدلہ جتنا جلد اتار دیا جائے یہی بہترین عمل ہے۔“ شرافت سے بات کرتا کرنا وہ بالآخر اپنی کمینی خصلت پر آمیا تھا۔

”اس احسان کا بدلہ ایسا اتار دوں گی کہ آپ تاحیات یاد رکھیں گے کہ کس سے واسطہ پڑا تھا آپ کا۔“ وہ دانت بچھج کر معنی خیر لہجے میں کہہ اٹھی۔

”اوہ..... گڈ! تو آپ مجھے کہنی دینے پر راضی ہو گئیں؟“ وہ مسرت سے جھوم اٹھا۔

”ہاں۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے۔“ وہ جبراً مسکرائی۔

”جھینکس..... جھینکس مائی سویٹ ہارٹ! میں بہت خوش ہوں۔ اتنا خوش کہ میری

”اس کو تو آتا ہی ہے۔“

”مثبت اب۔ میں کیا کہہ رہی ہوں، آپ کیا سمجھ رہے ہیں؟“

”جذبات و محبت کے طوفان کی بات کر رہی ہیں نا آپ؟“ وہ معصومیت سے بولا۔

”بکھی تو اسے نفس سے ہٹ کر بھی بات کر لیا کریں۔“ وہ بری طرح چڑھ گئی۔

”اندر کے طوفان سے زیادہ طاقت ور کوئی بھی طوفان نہیں ہوتا“

”جیونہہ..... آپ سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔“

”گھبراؤ نہیں۔ ہم کراچی دو یا تین گھنٹے میں پہنچ جائیں گے۔ ایسے چھوٹے چھوٹے طوفان تو یہاں آتے رہتے ہیں جو جلد ختم ہو جاتے ہیں۔“ اسے پریشان اور فکر مند دیکھ کر اس نے اذیت سے قہقہہ دیا۔

خضریٰ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یاہر جس بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اب سڑک کے دونوں جانب باغات تھے جہاں کثرت سے آم درختوں پر لگے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ہرے، پیلے، سرخ آم خوبصورت لگ رہے تھے۔

موسم کی تبدیلی وہ بہت دیر سے محسوس کر رہا تھا اور حالات کے پیش نظر ہی نہایت دش ڈرامیوئیک کر رہا تھا۔ جس اور وحشت بھری پراسراریت پتا دے رہی تھی کہ زیر دست طوفان آنے والا ہے اور وہ اس سے قبل کسی محفوظ ٹھکانے کی تلاش میں تھا۔ یہاں بہت وسیع رقبے پر آم کے باغات پھیلے ہوئے تھے۔ آبادی تھی لیکن نہایت مختصر۔

فاسلے پر کچے کچے گھر بنے ہوئے تھے۔ آگے کی جانب اسے ایک چھوٹی جھین ریت
 ہاؤس ٹائپ کی بنی ہوئی تھی عمارت نظر آ رہی تھی۔ اس کی کوشش جلد از جلد اس تک
 پہنچنے کی تھی۔

جب وہ اس تک پہنچا تو ایک دم ہی ماحول میں بھلا جس اور سناٹا ٹوٹ گیا۔ ہوائیں مست ہاتھیوں کے انداز میں چلتی، پتھراڑی ہوئی ہر شے کو اپنی گرفت میں جکڑنے لگیں۔ ہر طرف گرد و غبار پھیل گیا تھا۔

شازل نے سیاہ گیٹ کے پاس گارو کی تھی۔ اس کے برابر میں چائے کا ہوٹل تھا۔ ہوٹل کا مالک انہیں پہلے ہی دیکھ چکا تھا، سو کارڈر کہتے ہی دوڑا ہوا آیا۔ ہوا کی زد سے بچنے کے لئے اس نے دونوں ہاتھوں کی ادٹ میں چہرہ چھپایا ہوا تھا۔

”امیر آجائے صاحب! امیر آجائے۔ بڑی زوروں کا طوفان ہے۔ اللہ رحم کرے۔“

اس کے ہمراہ وہ اس بوتل میں آگے جو ایک بلا سے ہال پر مشتمل تھا۔ سامنے
باؤنڈری پر شیشے کی چوڑی برنیوں میں ایک باؤنڈری خانیاں اور زیرے کے بسکٹ رکھے نظر آ
ہے تھے۔ ان کے ساتھ ہی چائے کے گگ اور پلاسٹک کے جگ گلاس رکھے تھے۔
باؤنڈری کے نیچے شاید چولہا بنا ہوا تھا کیونکہ وہ دیوار پوری ڈھونگیں سے سیاہ ہو رہی تھی۔
اس کے ایک سائڈ لکڑی کی میز کرسیاں بڑی تھیں۔ اندر ان کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔
وہ سب طرف کا جائزہ لیتی ہوئی اس کے اشارے پر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

”نام کیا ہے تمہارا؟“ شانزل اس آدمی سے مخاطب ہوا۔

”رجب علی ہے میرا نام صاحب۔“

”اچھا نام ہے۔ رجب ٹی! کوئی گالک نہیں ہے یہاں؟ کوئی چائے پینے آیا نہیں یا نان سے ڈر کر بھاگ گیا؟“ شانزل مسکرا کر پوچھنے لگا۔

”اللہ کا بہت کرم ہے صاحب مجھ گناہگار پر۔ صبح شام گاہکوں سے مجھے فرمت نہیں ملتا۔ دوا کے بھی میرے ساتھ کام کرتے ہیں۔ اس وقت طوفان کی وجہ سے سب خلع

مجھے معلوم ہوا تو میں نے کہا کہ سائیں میں یہاں چائے کا ہوٹل کھول لیتا ہوں، اس طرح یہاں سارے دن رونق رہے گی۔ رات کو میں بیٹھا رک جایا کروں گا۔ سائیں کو یہ مشورہ پسند آگیا۔ اس طرح میں نے یہاں ہوٹل کھول لیا اور اوپر والے کے فضل و کرم سے ہوٹل خوب چل نکلا۔

”تمہارا گھر بار نہیں ہے؟“ شانزل کو اس میں دلچسپی پیدا ہوئی۔

”گھر بار کیا صاحب۔“ وہ ایک مختصر سی سانس لے کر گویا ہوا۔ ”ہاں باپ بہت پہلے دنیا چھوڑ گئے تھے۔ میں بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔ مجھ سے چھوٹی چار بہنیں اور تین بھائی تھے۔ جیسے تیسے کر کے انہیں پالا، شادیاں کیں۔ اب بھینس اپنے گھروں میں خوش ہیں اور بھائی اپنے بیوی بچوں میں مگن ہیں۔ سب فنی خوشی رہ رہے ہیں۔ سال چھ مہینے میں کچھ دنوں کے لئے جاتا ہوں، جو کچھ جمع کرتا ہوں بابت آتا ہوں۔“

”تم نے شادی کیوں نہیں کی؟“

”اس عمر میں کون مجھے بیٹی دے گا صاحب۔ جب عمر تھی تو فرائض اور ذمہ داریوں کے احساس نے کبھی اپنے بارے میں سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا۔“

”نمر سے کچھ نہیں ہوتا۔“ خضرئی کو اس پر ترس آگیا۔ وہ بولی تو شانزل اس کی بات قطع کر کے بولا۔

”ہاں، جب میں نوٹ ہونے چاہئیں۔ بہت لڑکیاں مل جاتی ہیں۔“

”جی نہیں۔ ایک شریک حیات کافی ہوتی ہے مرد کے لئے جو شوہر کو گھر کا آرام و سکون دے۔ شریف و عزت دار مرد کی زندگی میں ایک عورت آتی ہے بیوی بن کر جس کی خوشی شوہر کی خدمت میں اور سکون اس کی دفا میں ہوتا ہے۔ حیرت ہے بھائی، بہن جیسے مقدس اور اہم رشتے بھی اب خود غرضی، مفاد پرستی کے اندھیروں میں گم ہو چکے ہیں ورنہ انہیں خود احساس ہونا چاہئے آپ کا۔“ خضرئی کے لہجے میں ہمدردی محسوس کر کے رجب علی خاصا متاثر ہوا تھا۔

مجھے ہیں۔“ رجب علی نے سادگی سے پوری تفصیل اس کے گوش گزار کر دی۔

”ایسے طوفان یہاں اکثر آتے رہتے ہیں یا کبھی کبھی آتے ہیں؟“ شانزل نے کھڑکی سے باہر گرد آلود منظر دیکھتے ہوئے احتیاط کیا۔

”اس موسم میں اکثر آتے رہتے ہیں۔“

”اس طرح تو فصلوں کا بڑا نقصان ہو جاتا ہوگا؟“

”ہاں صاحب، بس کیا کریں، سب اوپر والے کی مرضی ہے۔“

”کتنی دیر تک رہتا ہے ایسا طوفان؟“ خضرئی نے پہلی بار لب کشائی کی۔

”ان کی کیا ڈائریکٹ ”اوپر“ سے لائن ملی ہوئی ہے جو انہیں وقت کے تعین پر گرفت حاصل ہو؟“ شانزل ہنس کر گویا ہوا۔ اس کے تسخیرانہ انداز پر خضرئی کے ماتھے پر تل پڑ گئے تھے۔ وہ ایک نگاہ پر ہم سی ڈال کر رہ گئی۔ جبکہ رجب علی کی سمجھ میں اس کی بات نہیں آئی تھی لیکن اسے پُر سکون، مطمئن اور بے غورانی سے جیسے دیکھ کر حیرانی سے بولا۔

”اتنا زبردست طوفان ہے، آپ کو ڈر نہیں لگ رہا؟“

”میری زندگی میں اس سے زیادہ بھیانک اور خطرناک طوفان آتے رہتے ہیں۔ عادی ہو گیا ہوں خطروں سے گزرنے کا۔“ وہ گہری نگاہوں سے خضرئی کی جانب دیکھتا ہوا کہنے لگا۔ اس بار اس دیہاتی کی شاید امت نہ ہوئی مزید سوال کرنے کی کہ وہ دوستی بات کر رہا تھا جو اس سادہ ذہن کے بندے کی سمجھ سے بالاتر تھی۔

”ریسٹ ہاؤس کی چابیاں کس کے پاس ہوتی ہیں؟“

”ریسٹ ہاؤس کی چابیاں چھوٹے سائیں کے پاس ہوتی ہیں۔ وہ کبھی کبھی آتے ہیں جب زمینوں کا کوئی معاملہ ہو جاتا ہے۔ اس کی صفائی، سترائی کے لئے بندے آتے ہیں ایک دو ہفتوں میں۔ بڑے سائیں سال میں ایک مرتبہ آتے ہیں۔“ رجب علی نے حسب عادت پوری تفصیل بیان کی۔

”دیکھیں یہاں ہوٹل کھولنے کی اجازت کیسے مل گئی؟“

”ایک مرتبہ یہاں چوری ہو گئی تھی۔ بڑے سائیں کو کسی چوکیدار کی ضرورت تھی۔“

”چائے والے بھی پلاؤ گے رجب علی بابا توں سے ہی۔“
 ”کیوں نہیں صاحب، انہی دو دو ہتی بنا کر لاتا ہوں۔“ وہ بہت جوش سے اٹھا اور چلے جانا لگا۔

باہر ایک دم ہی موٹی موٹی بوندیں پڑنی شروع ہو گئیں جس سے ہوا کے طوفان میں کمی واقع ہونے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے زبردست بارش شروع ہو گئی تھی۔
 ”آف۔۔۔ بہت تیز بارش ہے۔ اب نہ معلوم کب بند کرے۔“ حضرت علی نے کھڑکی سے جھانکا تو کچھ دور کھڑے شانزل سے پریشانی سے بولی۔
 ”کیا حرج ہے اگر نہ بھی رے تو۔“ اس نے دلچسپ نگاہوں سے اس کے پریشان چہرے کو دیکھتے ہوئے سرکشی کی۔

”سنا ہے اس برسات کے موسم میں بڑی کشش ہوتی ہے۔ رونے ہوئے کو قریب لے آتی ہے۔ دو قلب کو ایک جاں کر دیتی ہے۔“ اس کی آواز خمار آلود تھی۔
 ”اپنی حد میں رہیں آپ۔“ وہ نفرت سے ہنستے ہوئے سکڑ کر گویا ہوئی۔

لفظ چھین جائیں غلط منہ میں زبان رہ جائے
 جس طرح تیر چلے اور کہاں رہ جا۔
 آؤ، دو چار گھڑی بیٹھ کر دکھ سکھ باتیں
 جانے اس بھیڑ میں پھر کون کہاں رہ جائے

بہت گھبرائے میں شانزل نے اشعار پڑھے تھے۔
 ”صاحب! چائے کے ساتھ میسرے، بسکٹ وغیرہ کچھ لیں گے؟“ رجب میر پر چائے رکھتا ہوا پوچھنے لگا۔ دونوں نے ہی منہ کر دیا تھا۔

چائے کے دوران دونوں کی گفتگو جاری رہی تھی۔ وہ خاموشی سے کپ لے کر کھڑکی کے قریب آ گئی تھی۔ باہر بارش سے جل قتل ہو رہی تھی۔ گہرے بادل جن کی وجہ سے اندھیرا سا پھیل گیا تھا ان کے تیز ہمارے تھے کہ یہ جلد قابو آنے والے نہیں ہیں۔ اس کے اندر تک سناٹا پھیلتا چلا گیا۔ بارش کا موسم ویسے بھی اپنے اندر بہت ساری اداسیاں

اور یادیں لایا کرتا ہے۔ اس وجہ سے اسے یہ موسم پسند نہیں تھا۔ اس سے بھی اتالی کی یاد دل میں چٹکیاں مٹی لینے لگی تھی۔ وہ اس کی پریشانی سے بے خبر یہ سوچ کر مطمئن ہوں گی کہ وہ ثانیہ کی شادی انجوائے کر رہی ہے۔

”اگر انہیں معلوم ہو جائے کہ میں یہاں اس وحشی بھیڑیے کے کنبے میں پھنسی ہوئی ہوں تو کیا ہو گا؟ جس شخص کی پرچائیں سے بھی میں گریزاں تھی، آج اس کے ساتھ ہوں تو کیا ہو گا؟ وہ اس حقیقت کو برداشت کر پاؤں گی؟ شاید نہیں۔ نہیں۔۔۔ میں کسی حد سے کو برداشت کرنے کی تحمل نہیں ہو سکتی۔ اسی جان کو کھونے کے بعد اتالی کی جدائی ہرگز برداشت نہیں ہو گی۔“ اس نے گھبرا کر سوچا۔

موسم نے ہی کروٹ بدلی اور بارش میں شدت کے ساتھ ساتھ آسمان پر گرج چمک بھی زور شور سے شروع ہو گئی۔

واپسی کے سارے راستے بند ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔ وہ نہ بے جاں ہوتے جسم کو کھینٹ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

رجب علی لائین صاف کر کے جلا رہا تھا کیونکہ کمرے میں خاصا اندھیرا پھیل گیا تھا۔ لائین جلی تو مٹی کے تیل کی ناگوار بو اور چپتی سے نکلنے والے زرد اجالوں نے ماحول کو کسی آسیب زدہ ویرانے کا حصہ بنا ڈالا تھا۔ مدھم تا تو ان روشنی نے وہاں رکھی اشیاء کے سائے بھی لمبے کر دیئے تھے۔ خود رجب علی کا سایہ دیوار سے اونچا جا رہا تھا۔

وہ پریشان ہی سر جھکائے بیٹھی رہی۔ اتنا نحوست بھرا اور وحشت زدہ ماحول تھا کہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ یہاں سے اٹھ کر باہر بھاگ جائے۔ اتنی دور کہ کوئی ڈھونڈنے کے باوجود بھی نہ ڈھونڈ پائے۔

رجب علی تکبیرا سیٹا بھر رہا تھا۔ شانزل نا معلوم سو گیا تھا یا یونہی چہرے پر ہاتھ رکھ کر دھڑکی پر پاؤں پھیلائے آگے پیچھے بند کئے لیٹا تھا۔
 اندر صرف بادلوں کے گرجے اور بارش کی آوازیں تھیں۔
 شانزل اور رجب علی کے درمیان شاید باتوں کا اسٹاک ختم ہو گیا تھا۔

”آپ لوگوں کو پائے بنا کر دوں؟“ شاید اس نے بھی اس وحشت ناک خاموشی کو توڑنے کی غرض سے پوچھا۔

”نہیں یار! ایک تو پہلے ہی بن بلائے مہمان بن کر تم پر نازل ہو چکے ہیں۔ اب اگر اس طرح فرمائشیں کریں گے تو کہیں اس ٹھکانے سے بھی محروم نہ ہوتا پڑ جائے۔“ شانزل آنکھوں سے ہاتھ ہٹا کر سیدھا بیٹھتا ہوا مسکرا کر بولا۔

”نہیں، نہیں صاحب۔ ایسا بھلا کس طرح ہو سکتا ہے۔ بہت عرصے بعد لگ رہا ہے میں اپنوں کے درمیان ہوں۔ اب تو آپ کو چائے چینی پڑے گی۔“ رجب علی جوش سے بولا اور تازہ چائے بنانے لگا۔

”پلا دو یار! اتنی محبت سے کوئی نہ ہر بھی پلائے تو پی لینا چاہئے۔“

”جو محبت کرتے ہیں وہ نہر کہاں پلاتے ہیں صاحب۔“

”واہ! تم نے کبھی محبت کی ہے رجب علی؟“

”ہاں۔ مجھے اپنے بہن بھائیوں سے اور ان کے بچوں سے بہت محبت ہے بلکہ بہنوں میں تو میری روح بہتی ہے۔“

”اس کے علاوہ کس لڑکی سے محبت نہیں ہوئی؟“ وہ فحش کر بولا۔

”نہیں۔ وقت ہی نہیں ملا کبھی۔“ رجب علی اس قدر شرما کر بولا کہ شانزل کو شش کے باوجود اپنے تہمتوں پر قابو نہ رکھ سکا۔

”مسٹر شانزل خان آنریری! گھنیا گھٹو کرنے سے قبل یہ بھی دیکھو کہ تمہارے درمیان ایک تیسری ہستی بھی موجود ہے جو تمہاری صنف سے تعلق نہیں رکھتی۔ مہربانی فرما کر اپنی زبان کو شرافت و اخلاقیات کے دائرے میں لاؤ۔“

اسے پٹری سے اترتے دیکھ کر حضری، رجب علی کے خیال سے انگلیں میں گویا ہوئی۔ اسی لمحے رجب علی چائے ان دونوں کے آگے رکھ چکا تھا۔ شانزل نے مسکراتی نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا مگر کچھ کہا نہیں۔

”وقت بہت تیزی سے گزر رہا ہے۔ یہاں ایسا کوئی راستہ ہے رجب علی جس کے

ذریعے ہم کراچی جا سکیں؟“ چائے کے سب لیتے ہوئے وہ اس سے مخاطب ہوا۔ اس کے لہجے سے سنجیدگی جھلکے لگی تھی۔

”یہاں جتنے بھی راستے ہیں وہ اب دریا بن چکے ہوں گے اور ایسے میں گاڑی چلانا بہت خطرناک ہے۔ آپ صبح تک رُک جائیں۔ بارش بند ہو تو آپ چلے جائیے گا۔“ رجب علی نے خلوص سے مشورہ دیا۔

”نہیں، ہم رات یہاں کیسے رُک سکتے ہیں؟“ دو تخت متوجش ہوئی۔

”مجبوری ہے جی۔ دیکھیں تا بارش کتنی زوروں کی پڑ رہی ہے۔ رات بھی ہو گئی ہے اور راستے ویسے بھی جانے پہچانے نہیں ہیں آپ کے۔“

”تمہاری بات درست ہے۔ لیکن یہ بھی تو دیکھو کہ رات اس طرح گریبوں پر بیٹھے بیٹھے نہیں گزر سکتی۔ کہاں رہیں گے ہم لوگ؟“

”رینٹ باؤس کے ایک کمرے کی چابی ہے میرے پاس۔ عام حالات میں، میں کبھی یہ چابی کسی کو نہیں دیتا۔ کیونکہ بڑے سائیں نے مجھ سے یہ عہد لے کر چابی دی تھی کہ اس کمرے کو میں کبھی استعمال کروں گا جب میرے گھر والے مجھ سے ملنے آئیں گے۔ یعنی میں مستقل اپنے استعمال میں نہیں لا سکتا تو جب بھی کوئی بہن، بھائی ملنے آتا ہے تو میں وہ کمرہ استعمال کرتا ہوں۔ اس وقت آپ لوگ بھی مجھے اپنے سگوں کی طرح ہی لگ رہے ہیں تو میں وہ چابی آپ کو دے دیتا ہوں۔ آپ لوگ وہاں رُک جائیں۔“

”بہت بہت شکریہ یار! تم نے بڑا مسئلہ حل کر دیا ہے۔ لیکن تم کہاں سوتے ہو؟“ اس سے چابی لیتے ہوئے شانزل نے استفسار کیا۔

”ہر اہم بیٹھک میں میرا پلنگ پڑا ہے، میں وہیں سوتا ہوں۔“

”جھینٹکس گاڑا یہ بڑا مسئلہ تو حل ہوا۔ چلو تم بہت تھک گئی ہو، ذرا آرام کر لو۔ صبح دیکھیں گے کیا صورت حال ہوتی ہے۔“

وہ چابی لے کر اس کے نزدیک آ کر کہنے لگا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی

سے اٹھ کر اس کے ساتھ چل پڑی۔ رجب علی کے ہمراہ طویل راستہ عبور کر کے وہ کمرے میں پہنچے جو اوپر واقع تھا۔ فرش پر وائٹ چاندنی بچھی ہوئی تھیں اور دیواروں کے سہارے گاؤں کی رکھے ہوئے تھے اور ایک طرف کھیں رکھے نظر آ رہے تھے۔ رجب علی نے لائین ایک مخصوص جگہ پر رکھ دی تھی۔

”کمرہ تو بہت صاف ستھرا ہے۔“ شانزل نے جائزہ لے کر رجب علی سے کہا۔

”میں روزانہ صفائی کرتا ہوں یہاں کی۔ اب جی آپ آرام کرو۔ میں کھانے کا کچھ بندوبست کرتا ہوں۔“ وہ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

”میں بھی آ رہا ہوں، جہیں تمہاری میں ڈر تو نہیں لگے گا؟“ شانزل بولا۔

”نہیں۔“ اُس نے سپاٹ لیجے میں کہا اور چل اٹار کر چاندنی پر بیٹھ گئی۔ رجب علی کے جانے کے بعد شانزل بھی چلا گیا تو کچھ دیر وہ موقوف ذہن کے ساتھ لائین سے نکلنے والی زرد روشنی کو دیکھتی رہی۔ وہ ایک کے بعد ایک نئی مشکل کا شکار ہو رہی تھی۔ ان مشکلات و حادثات سے فرار کہاں ممکن تھا اس کے لئے۔

شانزل کو گھنے خاصی دیر گزر چکی تھی۔ ایک ہی ڈاؤنچے سے بیٹھے بیٹھے اس کا جسم اکڑ گیا تھا۔ گاؤں کی گھسیٹ کر کچھ دیر بعد اٹھنے کا ارادہ کر کے لیٹ گئی۔

باہر بادش کی حشر سامانیاں جاری تھیں۔ گرج چمک میں کچھ کمی واقع ہوئی تھی۔ ساری تھکاوٹ اور بے سکونی خند بن کر اس پر غالب آئے گی۔ اس کا سونے کا ارادہ بالکل نہیں تھا۔ وہ محسوس کر رہی تھی جیسے جیسے وقت گزر رہا ہے، شانزل کی نگاہوں میں چمک بڑھتی جا رہی ہے اور وہ اسے کوئی موقع فائدہ اٹھانے کا فراہم کرنا نہیں چاہتی تھی۔ کافی دیر تک نیند بھگانے کے لئے جدوجہد کرتی رہی، لیکن کب تک؟ نیند سے بھی کوئی جیت سکا ہے؟ کسی کمزور لمحے میں نیند اُس پر قابو پا چکی تھی۔ وہ ارد گرد سے بے خبر سو رہی تھی۔

اچانک ہی دل دہلا دینے والا دھماکا ہوا تھا..... آواز اتنی شدید تھی کہ وہ جونہ معلوم کب سے بے خبر سو رہی تھی، گھبرا کر بیدار ہو گئی۔

آنکھیں کھولنے کے بعد سوتل انداز میں اس نے لیٹے لیٹے ہی گردن اُدھر گھمائی۔ لائین سے نکلتی زرد روشنی غائب تھی۔ ہر طرف اندھیرے کا راج تھا۔ باہر بادش طوفانی شدت اختیار کر چکی تھی۔

مخا اُسے وہاں کسی اور کی موجودگی کا احساس ہوا اور احساس ہوتے ہی اس کے ذہن میں چھناک ہوا تھا۔ ”آہ..... میں کیوں سوئی؟“ اُس نے وحشت زدہ ہو کر اٹھنا چاہا۔

”کیا ہوا؟“ اندھیرے میں شانزل کی آواز بہت قریب سے ابھری تھی.....!

✽✽✽

تھیں میری بات پر یقین نہیں آیا، ابھی تک یہی سمجھ رہی ہو کہ میں انہما کر کے لایا ہوں اور سوچ دیکھ کر فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ سوچو، کچھ عقل کو بھی استعمال میں لاؤ۔ اگر مجھے یہی سب کرتا ہوتا تو مجھے وہاں وجاہت سومر کی حویلی میں کیا قیامت تھی؟ کون میرا راستہ روک سکتا تھا وہاں۔ تم جو دروازہ اندر سے لاک کر کے سمجھ رہی تھیں کہ اب کوئی اندر نہیں آ سکتا تو یاد رکھنا، ایسی جگہوں پر بہت سے خفیہ دروازے ہوتے ہیں۔ میں کسی دروازے سے بھی اندر آ سکتا تھا اگر مجھے یہی سب کرتا ہوتا۔ بہت سے مواقع تھے مگر میں کبھی مجبوریاں نہیں خریدتا۔ کھرا اور صاف ستھرا سودا پسند کرتا ہوں، شیر نہیں ہوں۔“

وہ چند لمحے خاموشی ہوا، نیچے گرا ہوا اس کا دوپٹہ اٹھا کر اس کے ساکت و صامت وجود پر ڈال دیا۔ کمرے میں ایسی ہی خاموشی چھا گئی جو طوفان کے بعد چھاتی ہے۔ خضریٰ کھنٹوں میں منہ چھپائے خاموشی سے آنسو بہا رہی تھی۔ کبھی کوئی حیرت انگیز فضا میں گونج اٹھتی تھی۔ باہر بارش مسلسل ہو رہی تھی۔

”کب تک رونے کا ارادہ ہے؟ میں نے فریج آلیٹ بنائے تھے گرم گرم، یہاں ڈنر بھیجا تھا۔ رجب علی لے کر آیا تو تم سو رہی تھیں۔ اس سے باتوں میں کافی وقت گزر گیا تھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ تم بھوکی ہو۔ یہاں آیا تو کمرے میں اندیرا پھیلا ہوا تھا اور اتنی دم باہر کہیں بجلی گری تھی۔ تم چیخ کر اٹھ بیٹھیں، میں سمجھا تم نیند سے بیدار ہونے کے باعث خوفزدہ ہو گئی ہو۔ سو تمہیں تسلی دینے کے لئے تمہاری طرف بڑھا تھا اور تم.....“ اس نے طویل سانس لے کر بات قطع کر دی۔ ”یقیناً تمہیں میرا یہ سچ بھی کوئی جھوٹی اسٹوری لگ رہا ہوگا۔ کیونکہ میں تمہاری سوچوں سے، طبیعت سے واقف ہو گیا ہوں اور از حد افسوس ہے تمہاری محبت و سوچ اور کم نہیں پر۔ بہت غربت کا شکار ہو اس معاملے میں۔“ وہ تاسف بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ خضریٰ کی پوزیشن میں اب بھی کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

”میں باہر ٹھیکری میں ہوں، کھانا کھا لو ٹھنڈا ہو جائے گا۔ اگر پتا ہو تو اندر سے بند کر

لینا۔“ وہ کہہ کر سیدھا کمرے سے نکل گیا۔

بارش دوسرے دن صبح تک لانی ہو رہی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ دوپہر تک کم ہوئی تھی۔ شانزل نے بھی فوراً وجہ علی کو خدہ حافظہ کہا تھا۔

بارش بند ہو چکی تھی۔ صرف دھیمی پھوار گر رہی تھی۔ طوفان کے زور سے کئی جگہوں پر درخت کی شاخوں سے نئی ہوئی جھونپڑیاں ٹوٹ کر بکھری ہوئی تھیں۔ بارش کے باعث راستہ بہت خراب ہو گیا تھا۔ سڑک پر کئی جگہ گڑھے پڑ کر ان میں پانی بھر گیا تھا۔ چکنی مٹی نے سڑک پر پھسلن پیدا کر دی تھی۔ شانزل بہت محتاط انداز میں گاڑی چلا کر رہا تھا۔

رات سے اس نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ عجیب سرد مہری و بیگانگی خضریٰ کے رویے میں در آئی تھی۔ شانزل نے بہت کوشش کی اس خاموشی کو توڑنے کی مگر کامیاب نہ ہوا۔ کار خیزی سے کراچی کی حدود میں داخل ہو رہی تھی۔

”جھینکس گاڑا یہاں کا موسم خراب نہیں ہے۔“ شانزل نے سپر ہائی وے پر گاڑ دوڑاتے ہوئے خضریٰ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”ابھی تک ناراض ہو؟ حیرت ہے، آپ اس قدر ضدی و خود سر ہوں گی، میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں بے تصور ہونے کے باوجود ایکسکیوز کر رہا ہوں پھر بھی آ.....“

”آپ مجھے یہیں اتار دیں۔ یہاں سے میرا گھر قریب ہے، میں چلی جاؤں گی۔“ کاروائٹ ہال کے قریب سے گزرتے دیکھ کر وہ بولی۔

”گھر تک پہنچا دوں گا۔“ اس نے اطمینان سے کہا۔

”نہیں، یہ میری عزت اور وقار کا معاملہ ہے۔ میں آپ کے ساتھ نہیں جا سکتی۔“ وہ خیزی سے دو ٹوک لہجے میں کہہ اٹھی۔

”پہلے لٹچ کر لیتے ہیں۔ صبح بھی تم نے صرف چائے پی تھی۔“

”نہیں۔ میں صرف گھر جاؤں گی۔“

”اتنی آسانی ہے؟“

”اگر اب تم نے میرے لئے کوئی مشکل پیدا کرنے کی کوشش کی تو دیکھ لینا اپنا

انجام بھی۔“

”ہاں..... میری بھی یہی خواہش ہے کہ میرا انجام تمہارے ہاتھوں ہو۔“ وہ ہنس کر بولا۔ چند لمحے اس کا جارحانہ تیور دیکھتا رہا پھر ایک سائیڈ میں کار روک دی۔

”جانے سے پہلے وعدہ کر کے جاؤ۔ کب ملو گی؟ آئی میں، احسان کا بدلہ کب اتارنے آؤ گی؟“

”کبھی نہیں، سمجھے؟“ اس نے دروازہ کھولتے ہوئے غرا کر کہا اور ساتھ ہی قریب سے گزرتے رکشے کو روکا اور سرعت سے کار سے نکل کر رکشے میں بیٹھ گئی۔ شانزل کی جانب اس نے مڑ کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔

شانزل ہونٹ پیچھے رکشے کے پیچھے آؤتی و حوال کو دیکھتا رہ گیا۔

”یا اللہ! میں فکا گئی۔ میں با عصمت واپس آ گئی، آپ کا بہت کرم ہے، بہت احسان ہے یا رب العالمین! مجھے گناہ گار بندی پر بہت بڑا کرم ہے۔“ گھر آتے ہی اس نے غسل کر کے کپڑے بدلے اور جانا نماز بچھا کر نماز پڑھنے کھڑی ہو گئی۔ نماز کے بعد دعا مانگتے ہوئے بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جب گھر آئی تھی تو اتالیبی گھر میں نہیں تھی۔ دروازے میں باہر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔ ایسا تب ہوتا تھا جب وہ پڑوس میں گئی ہوتی تھیں۔ اور وہ یہی چاہتی تھی کہ اس وقت اتالیبی سے اس کا سامنا نہیں ہو کہ کس طرح اپنا بھرم رکھ پائے گی۔ اس وقت تو اس وحشی کے حصار سے با عزت نکل آنا اس کے لئے کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔

دل و دماغ پر چھایا گزرے وقت کا غبار آئینوں کے ذریعے بہہ گیا تو طبیعت ایک دم ہلکی پھلکی ہو گئی اور شدت سے بھوک اور نیند محسوس ہونے لگی۔ لیکن میں اتالیبی، وال چاول پکا کر رکھ گئی تھیں اور ایک ڈش میں آم کا چارہ رکھا ہوا تھا۔ اپنا پسندیدہ کھانا دیکھ کر اس کی طبیعت باغ باغ ہو گئی۔ کھانا نکالنے سے قبل اس نے چوبلے پر چائے کا پانی رکھا، بھر کھانا نکال کر وہیں بیٹھ کر کھانے لگی۔ بھوک کچھ ایسی ہی زوردار تھی کہ اس

نے اتالیبی کی آمد کا بھی انتظار نہیں کیا۔ کھانے اور چائے سے فارغ ہونے کے بعد بخار گندم سر چڑھ کر بولنے لگا تھا اور وہ پلنگ پر لیٹتے ہی گہری نیند سو گئی۔

ملازم نے ٹرائی ایک طرف رکھی اور طائرانہ نگاہوں سے کمرے کا جائزہ لیتے لگا۔ سر کی کار بیٹ پر جگہ جگہ چلی ہوئی سگریٹوں کے ٹکڑے ٹکڑے ہوئے تھے۔ اور وہ بیڈ پر بڑے بے ترتیب انداز میں بے خبر سو رہا تھا۔ عارفین نے جو اس کا خاص ملازم تھا اور اس سے شدید محبت کرتا تھا، بڑی رنجیدگی سے اپنے مالک کی سمت دیکھا تھا۔ وال کلاک کی سوئیاں دس کے ہند سے پر ہرجان تھیں۔ اس نے آگے بڑھ کر کھڑکیوں سے بھاری پردے ہٹائے تو کمرہ روشنی سے بھر گیا ورنہ ویز پردوں کے باعث رات کا گمان ہو رہا تھا۔

”صاحب..... صاحب جی.....!“ اس نے تھوڑا سا جھک کر مودبانہ لہجے میں اسے کئی آوازیں دیں۔

”ہوں.....!“ اس نے آنکھیں بند کئے ہوئے کہا۔

”صاحب! اٹھ جائیے۔“

”کیوں؟“

”صبح ہو چکی ہے۔ آپ نے کہا تھا، دس بجے آپ کو جگا دوں۔“

”صبح ہو گئی؟“ نیند سے بوجھل پلکیں اس نے بمشکل کھولیں۔

”جی صاحب۔ بڑے صاحب بھی آپ کا کل سے پوچھ رہے ہیں۔ اب تو دفتر چلے گئے۔“

”چائے دو۔ بہت خالم ہو عارفین یا رتم۔ بڑی مشکل سے دو دن بعد نیند مہربان ہوئی تھی۔ تم نے فوراً ہی بھگا دیا۔“ اس نے نیم دروازہ ہو کر چائے کا گگ پکڑتے ہوئے کہا۔

”معافی چاہتا ہوں صاحب! اگر آپ مجھے وقت پر اٹھانے کا حکم نہ دیتے تو میں ایسی

گستاخی کبھی نہیں کرتا۔“ عارفین گڑ بڑا گیا۔

”کوئی بات نہیں، غلطی میری ہے۔ میرے پیچھے کسی کی کالز وغیرہ آئیں؟“

”جی صاحب! جنیفر صاحبہ کی کئی کالز آچکی ہیں۔ وہ آپ سے ملنے کے لئے ہے۔“

”جین ہیں۔ سویرا صاحبہ، ربیکا صاحبہ، شہوانہ ملک صاحبہ۔۔۔۔۔“

”اچھا، اچھا۔۔۔۔۔ سب ملنا ہی چاہ رہی ہوں گی۔“ اس کے اندر لپٹا تک ہی بے دلی سی عود کر آئی تھی اور وہ عارفین کی بات قطع کر کے گویا ہوا۔ کیونکہ وہ اپنے فریڈز کی کالز کے متعلق جاننے کا خواہش مند تھا۔ فی الحال تو ان لڑکیوں کی طرف خیال نہ تھا۔

”شہریار صاحب آئے تھے کل۔ وہ چند مفتوں کے لئے ملک سے باہر گئے ہیں۔“

”کہہ گئے ہیں کچھ دنوں بعد آپ کو خود فون کریں گے۔“

”اوکے، میرا سوٹ نکال دو۔ ناشتہ ہلکا چھلکا تیار کرانا اور ملازمہ کو کہہ کر کمرے کی صفائی کرواؤ۔“ وہ چائے کا گلاسے پکڑا کر بیڈ سے اٹھ گیا۔

”بہتر صاحب!“ عارفین وارڈ روپ کی جانب بڑھتے ہوئے آہستگی سے بولا۔

”کیا ابھی تک تمہاری محنتن اتری نہیں بیٹی؟ ایک دن تو تم نے سونے، جاگنے میں

گزار دیا۔ میں نے بہت کوشش کی، شادی والے دن آنے کی۔ مگر فائرہ کی طبیعت اس

دن خراب ہو گئی۔ رات کو جا کر وہ قارغ ہوئی، اب کوئی اس کے پاس تھا نہیں، اس پر دو

دو بچوں کا ساتھ اور بچے بھی اس قدر تنگ کرنے والے کہ بس پوچھو نہیں۔ بے چاری

فائرہ بری طرح پریشان ہے۔ اس کا میاں پرسوں آیا تو میں اس سے اجازت لے کر آ

مگی اور سوچ رہی تھی کہ جا کر تمہیں بھی لے آؤں اور معذرت بھی کر آؤں۔“

انابی ناشتے کے دوران مسلسل بول رہی تھیں اور وہ سوچ رہی تھی کہ بہت اچھا ہوا اتنا

بی کو موقع نہیں ملا چینیہ کی شادی میں جانے کا۔ ورنہ اسے وہاں موجود نہ پا کر ان کا کیا

حال ہوتا؟

”مختصری! کیا بات ہے بیٹی، کچھ پریشان ہو؟ جب سے آئی ہو بہت خاموش ہو۔“

منا ان کو اس کی غیر معمولی خاموشی کا احساس ہوا تو چائے کا گگڑے میں رکھ کر فکر مندی سے پوچھنے لگیں۔ ان کو فکر مند دیکھ کر وہ ہوش میں آئی کہ یہ کیا کر رہی تھی۔ وہ ان سے اس واقعے کو چھپانے کا سوچ بچکی تھی۔ پھر اس طرح کیوں ان کو کچھ سمجھنے کا موقع دے رہی تھی۔ وہ تو ویسے بھی اس کے بارے میں از حد حساس تھیں۔

”نہیں انابی! بس ایسے ہی سستی سوار ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے خود کو ہشاش بشاش ظاہر کیا اور بہت توجہ سے ان کے قریب بیٹھ کر باتیں کرنے لگی۔

انابی کی گفتگو وہی رسمی سی تھی جو عموماً شادی کے بارے میں کی جاتی ہے کہ سسرال

والے کیسے ہیں؟ دولہا کیسا لگ رہا تھا؟ خانہ پر دلہن بن کر بہت روپ آیا ہو گا۔ جہیز

میں کیا کیا سامان دیا؟ وہاں سے بری کیسی آئی؟ رخصتی کب ہوئی وغیرہ وغیرہ۔ وہ بہت

احتیاط سے اس طرح گول مول جواب دے رہی تھی کہ انابی کو ذرا بھی محسوس نہیں ہوا کہ

وہ جھوٹ بول رہی ہے اور اسے اپنے آپ پر حیرت تھی کہ کس طرح وہ بہت دلیری و

صفائی سے جھوٹ پر جھوٹ بولے جا رہی ہے۔ اس سے قبل تو کبھی جھوٹ بولنے کی

کوشش میں وہ اس طرح کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ شاید اس کے پیش نظر انابی کی صحت و

بقا کی وجہ تھی۔

انہیں یہ سب بتا کر گویا اس کے ذہن سے بھی ایک بوجھ ہٹ گیا تھا ورنہ اسے یہی فکر

پریشان کر رہی تھی کہ کس طرح وہ انابی سے چھپائے گی؟ اس طرح کل سے وہ عید کے

بہانے خاصا وقت گزار چکی تھی۔ بالآخر یہ بوجھ بھی دور ہوا تھا۔

خانہ پہلے بتا کر چاچکی تھی کہ وہ رخصت ہو کر لاہور چلی جائے گی، سو اس کی جانب

سے اسے خدشہ نہیں تھا کہ وہ آ کر اس کا جھوٹ ثابت کر دے گی۔

”آفس نہیں جاؤ گی بیٹی؟“ اسے اطمینان سے پھر پھر دیکھ کر وہ گویا ہوئیں۔

”وہ۔۔۔۔۔ وہ انابی! میری ملازمت، مطلب یہ کہ میں نے ملازمت چھوڑ دی ہے

وہاں سے۔“ روز روز کیسے بہانے بنا سکتی تھی۔ آج سچ بتانے کا فیصلہ کر لیا۔ انہوں نے

چند لمحے غور سے اس کی جانب سوچتی نگاہوں سے دیکھا، پھر ایک اطمینان بھرا سانس

کر بیویں۔

”اچھا ہوا، ایسے بدکردار آدمی کے ساتھ کب تک گزارا کر سکتی تھیں۔ ملازمت ہماری ضرورت سہی مگر عزت اس سے زیادہ ضروری ہے۔“

”اگر آپ کو معلوم ہو جائے کہ گھر سے باہر یہ سارا وقت میں اس بدکردار شخص کے ساتھ گزارا کر آئی ہوں، وہ بھی باعزت تو آپ کو میری زبان اور اس کی شرافت کا یقین آ جائے گا؟“ اس نے انابی کی جانب دیکھتے ہوئے سوچا۔

”اچھا۔۔۔ تو یہ فکر تم پر سوار ہے، تب ہی اس قدر خاموش و پریشان دکھائی دے رہی ہو۔ کوئی بات نہیں، ایک در بند ہوتا ہے تو کوئی در کھل جاتے ہیں۔ روزی دینے والا اپنے بندوں سے غافل ہرگز نہیں رہتا۔ بہت جلد انشاء اللہ کوئی نہ کوئی بندوبست ہو جائے گا۔“ وہ بڑے دلار سے اس کو قتل دے رہی تھیں۔ جبکہ یقیناً حالات کی نزاکت محسوس کر کے ان کی آنکھوں میں ٹکرات جھلکنے لگے تھے۔

”انابی، فخر و باجی کے ہاں سے مجھے اس ہفتے کی تمام اخبار لا دیں۔ اردو، انٹرنیشنل دونوں۔ شاید وہاں کوئی خالی دیکھنی نظر آ جائے۔“

انہوں نے پہلے اخبارات لا کر دیئے پھر پکانے کا سودا لینے بازار چلی گئیں اور وہ اخبارات پھیلانے مطلوبہ نوکری تلاش کر رہی تھی۔

ایک گھنٹے سے زیادہ وقت گزارنے کے باوجود کوئی ڈھنگ کی نوکری کا اشتہار موجود نہیں تھا۔ اس نے بد دل ہو کر اخبارات ایک جانب رکھے اور کچن کی جانب بڑھ گئی۔ انابی ابھی تک نہیں آئی تھیں۔ اس نے آٹا نکال کر گوند حنا شروع کر دیا۔ فارغ ہوئی تو اسی دم انابی آ گئیں۔ وہ پکانے کے لئے قیمہ پالک لے آئی تھیں اور ایک لفافے میں گرم سموے۔

”لو، کھا لو۔ مانتے میں بھی صرف چائے پی ہے۔“ وہ پلیٹ میں سموے نکال کر اس کی جانب بڑھائی ہوئی کنبے لگیں۔

”کھانا آج میں ہی بناؤں گی۔“

”نہیں، تم آرام کرو۔ یہ کام میرا ہے۔“

”آپ اس عمر میں آرام نہیں کرتیں اور مجھے آرام گزار رہی ہیں۔“ سموے کھاتے ہوئے وہ ہنس کر بولی۔

”یہ چند روز ملے ہیں تو آرام کر لو۔ ورنہ صبح سے رات تک کہاں آرام نصیب ہوگا۔“ انابی نے اسے کچن میں نہیں جانے دیا اور خود بھی بہت جلد پکا کر فارغ ہو گئیں۔ اس عمر میں بھی ان کی پھرتی اور تناسل قابل دید تھی۔ وہ ہر کام بہت پھرتی اور منطقی سے کرتی تھیں۔ خاص طور پر کھانا بہت مزیدار بنایا کرتیں، کسی وقت میں ان کے ہاتھ کی سلائی، کڑھائی بہت مشہور تھی۔ اب آنکھوں کی کمزور بصارت کے باعث لوگوں کے لئے سلائی نہیں کرتی تھیں مگر اپنے اور خضری کے کپڑے خود سیتی تھیں۔ خاص طور پر خضری کے کپڑوں کی ڈیزائننگ اسی طرح سے کرتیں کہ عام کپڑا بھی خاص لگتا تھا۔

جب تک وہ پکانے سے فارغ ہوئیں تو خضری گھر کی منٹائی کر چکی تھی۔ وہ کچن سے باہر آئیں اور خضری کے لئے چائے کا ایک کپ بنا کر لے آئیں۔ وہ اس کا ایسے ہی خیال رکھتی تھیں جتنا ایک لائق و فائق ہونہار کماؤ پوت کا رکھا جاتا ہے۔

”کیا بات ہے انابی، آپ کیوں اس طرح چکر لگا رہی ہیں؟“ چائے پینے کے دوران اس نے محسوس کیا وہ کچھ منظر بے سی ادھر ادھر گھوم رہی ہیں تو پوچھ بیٹھی۔

”وہ۔۔۔ کچھ نہیں۔۔۔ دراصل مجھے جانا ہے۔“

”کہاں؟“

”وہ۔۔۔“ اس لمحے انابی کی بوکھلاہٹ ظاہر تھی۔ ایسا لگ رہا تھا وہ کچھ چھپا رہی ہیں لیکن چھپا نہیں پا رہی ہیں۔

”وہ فخر و باجی کے ہاں جاتا ہے۔ وہاں مجھے دیر ہو جائے تو گھبرانے لگیں۔“ انہوں نے لگا ہی جہاں کہا۔

”اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟ چلی جائیں آپ۔“

”اچھا، میں جارہی ہوں۔ قیمہ چوبیسے پر دکھا ہے۔ نماز لگ جائیں، پانی خشک ہو

جائے تو بھون کر پاک ڈال دیتا۔ وہ پانی میں بھیجا ہوا ہے۔“

”اچھا۔“ اس نے ان کے جانے کے بعد اندر سے کنڈی لگائی اور ایک مرتبہ پھر اخیارات کا باریک بینی سے جائزہ لینے لگی۔

شاہ ذریب صاحب جو بیٹے کا شدت سے انتظار کر رہے تھے، آج گزرتا دوسرا دن بھی جب اس کے انتظار میں کٹ گیا اور آنے والا نہیں آیا تو ان کے اندر بیٹے کی جانب سے تڑپ اور فکر میں شدید اضافہ ہو گیا۔ وہ اہم میٹنگ کینسل کر کے گھر چلے آئے۔

شانزل خان ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ان کی زندگی کا واحد سہارا۔ وہ اسے اپنی جان سے بڑھ کر عزیز رکھتے تھے اور یہ اس کی شدید ترین محبت کی تاثیر ہی تھی جو وہ اپنا از حد قیمتی پرنس فور کینسل کر کے وطن چلے آئے اور اپنے وسیع با اختیار اثر و رسوخ کے ذریعے ان لوگوں کو کینفر کردار تک پہنچا ڈالا جو ان کے بیٹے کے دشمن بن بیٹھے تھے۔ کام کچھ ایسی سرعت اور خاموشی سے ہوا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی تھی۔

”عارفین! شانزل کہاں ہے؟“ انہوں نے بریف کیس اسے دیتے ہوئے استفسار کیا۔

”جھوٹے صاحب اپنے کمرے میں ہیں۔“ اس نے فرمانبرداری سے کہا۔

”کمرے میں۔۔۔ طبیعت تو ٹھیک ہے اس کی؟ صبح سے اب تک کمرے میں کیوں ہے؟“ جواب کے لئے انہوں نے عارفین کا انتظار نہیں کیا اور بے قراری سے کمرے کی طرف آگئے۔ کمرے کا دروازہ کھولتے ہی ناگوار ہونے ان کا استقبال کیا۔ کمرے میں نیم اندھیرا تھا۔ حالانکہ باہر شام کی خوبصورت روشنی ہر سو پھیلی ہوئی تھی۔ انہوں نے چند قدم آگے بڑھ کر کھڑکیوں کے گلاسز سے پردے سرکاتے تو وہاں خوبصورت اچالا بکھر گیا اور وہ سامنے بیٹھا نظر آگیا جس کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی انہیں محسوس ہوا کہ گویا کسی نے ان کا دل مٹھی میں لے کر مسل ڈالا ہو۔

”عارفین! پردے ڈال دو، مجھے روشنیوں کی ضرورت نہیں ہے۔“ منہ سے دھواں

خارج کرتے ہوئے اس نے لڑکھڑاتے لہجے میں کہا۔

”آپ اندھروں سے دوستی کب کر بیٹھے میری جان! یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟ میں کب سے تڑپ رہا ہوں اپنے بیٹے کے لئے اور یہ کیا ہو رہا ہے؟“

بڑھی ہوئی شیو، پڑھن لباس، بے ترتیب بکھرے بال اور نشے کی زیادتی سے سوئے ہوئے چوٹے، پوٹیل انگاروں کی طرح دکتی ہوئی آنکھیں، عجیب سی وحشت اور بے چارگی اس کے چلیے سے جھٹک رہی تھی۔ وہ افسردہ اور دل گرفتہ سے اسے دیکھتے رو گئے۔

”اوہ۔۔۔ ڈی۔۔۔ ڈیڈی آپ؟“ باپ کو سامنے دیکھ کر وہ جلدی سے کھڑے ہونے کی کوشش میں اس دور سے لڑکھڑایا کہ اگر آگے بڑھ کر وہ اسے سہارا نہ دیتے تو وہ ٹھیل پر منہ کے بل گرنا۔

”یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟ کیا ہوا ہے؟ کیا جھگڑا ہوا ہے کسی سے؟“ وہ اسے بازو کے گھیرے میں لے کر صوفے پر بیٹھ گئے۔

”مجھے۔۔۔ سے۔۔۔ کون۔۔۔ جھگڑا۔۔۔ کر سکا۔۔۔ ہے۔۔۔ ہمت۔۔۔ نہیں۔۔۔ کسی۔۔۔ کی۔۔۔“

”اس وقت حواسوں میں نہیں ہو، بہتر ہے آرام کرو۔ صبح ملاقات ہوگی۔“

ٹھیل پر رکھی ایٹش خمرے دیکھ کر ان کی پیشانی پر سلونٹیں پڑ گئیں۔ شانزل اس وقت نشے میں دھت تھا۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں اور سران کے شانے سے چاکا کا تھا۔

شاہ ذریب صاحب نے بڑی محبت سے اس کے بکھرے بالوں میں انگلیاں پھیریں اور پھیرتے رہے۔ جو ان بیٹے کی ایسی حالت پر ان کے دل پر چر کے لگ رہے تھے۔ اس کے ذہن تک کرنے کی عادت اور سرگرت نوشی ان سے مخفی نہیں تھی بلکہ لڑکیوں سے دوستی، تعلقات کی نوعیت سے بھی پوری طرح باخبر رہا کرتے تھے۔ اور ان کی نگاہ میں اس کی یہ حرکتیں معیوب یا قابل سرزنش نہیں تھیں کہ جس سوسائٹی میں وہ منور کرتے تھے، وہاں ایسی سرگرمیاں اشنس کا حصہ تھیں۔ روک ٹوک، پابندی کا تصور ہی نہ تھا۔ لیکن اب بیٹے کی حالت، دیکھ کر انہیں محسوس ہوا کہ وہ غافل رو گئے۔

”خضر..... خضر..... خضر.....“ اچانک ہی مدبوٹی کے عالم میں وہ بڑبڑایا تھا۔ پھر ایک دم پہلے کی طرح غافل ہو گیا۔

شاہ زیب صاحب چونک اٹھے۔ اس کے منہ سے کسی لڑکی کا نام سننا کوئی تعجب خیز بات نہ تھی بلکہ جس بات نے چونکایا، وہ اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جس سے وہ سمجھ گئے کہ اس نام کی ٹینشن سٹانزل کو جکڑے ہوئے ہے جس نے اسے اس حال کو پہنچایا ہے کہ وہ دین و دنیا سے بے نیاز باپ سے لاپرواہ شدید نشے میں بھی اس کے نام کو رٹ رہا ہے۔

کافی دیر وہ اس کا سر شانے سے لگائے بیٹھے سوچے رہے پھر عارفین کو آواز دی۔
”انہیں معلوم تھا وہ حسب عادت دروازے کے پاس موجود ہوگا اور ایسا ہی ہوا تھا۔ پہلی آواز پر ہی وہ اندر آ کر بولا۔

”جی صاحب!“

اس کی مدد سے انہوں نے سٹانزل کو بیڈ پر لٹایا اور اسے کھڑکیوں پر پردہ ڈال کر باہر آنے کا حکم دے کر اپنے روم میں آ گئے۔ بیڈ کی ایسی حالت دیکھ کر انہیں اپنے سارے حوصلے ٹوٹنے ہوئے محسوس ہوئے۔ انہوں نے اس کے لئے بہت اچھے روشن خواب دیکھے تھے مگر وہ کن راستوں پر چل نکلا تھا۔ روشنیاں چھوڑ کر اندر سے دھچکیوں کی ہونٹ تھی؟

”بڑے صاحب! آپ نے مجھے بلایا تھا؟“ چند لمحوں بعد عارفین آ کر مژدبانہ لہجے میں بولا۔

”سٹانزل سے کون کون ملے آیا تھا؟“

”کافی لڑکیاں آئی تھیں، لیکن صاحب پہلے ہی حکم دے چکے تھے کہ کوئی آئے تو کہہ دوں صاحب گھر پر نہیں ہیں اور میں نے یہی کہنا۔ سب ہی واپس چلی گئیں۔ صاحب کسی سے بھی نہیں ملے۔“

”ہوں..... سب لڑکیوں کو جانتے ہو؟ ان کے نام معلوم ہیں؟“

عارفین نے ایک طویل فہرست ان کے گوش گزار کر دی، سٹانزل کی گرل فرینڈ کی، مگر مطلوبہ نام انہیں نہیں ملا تو کافی توقف کے بعد وہ گہرے لہجے میں پوچھنے لگے۔
”کوئی نام بھول تو نہیں گئے؟“

”نہیں صاحب! مجھے اچھی طرح یاد ہیں اور سب کو جانتا ہوں۔“

”خضر..... کون لڑکی ہے یہ؟“ وہ اسے بغور دیکھتے ہوئے گویا ہوئے۔

”خضر.....؟ اس نام کی تو کوئی لڑکی صاحب کی دوست نہیں۔“

”شیدر؟“

”جی صاحب جی! مجھے پکارتین ہے، صاحب کی اس نام کی کوئی دوست نہیں ہے۔“
پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ”ہو سکتا ہے صاحب جو ابھی کچھ دن شہر سے باہر رہے ہیں وہاں ان کی اس لڑکی سے ملاقات ہو گئی ہو تو معلوم نہیں۔“

”پھر آج سے تمہاری ڈیوٹی ہے یہ، مجھے معلوم کر کے بتاؤ یہ لڑکی کون ہے؟ کہاں رہتی ہے؟ کیا فیملی بیک گراؤڈ ہے اس کا؟ اور تم جانتے ہو نا اگر اس بات کی خبر تم نے سٹانزل کو کر دی تو میں تمہارا کیا حشر کروں گا؟“ انہوں نے سرد لہجے میں کہا تو وہ فوراً ہاتھ جوڑ کر خوفزدہ لہجے میں بولا۔

”میں کبھی آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔“

”انا بی! کہاں رہ گئیں آپ؟“ اس نے پھیلے اندھیرے کو دیکھ کر پریشانی سے سوچا۔ وہ بارہ بجے گھر سے گئی تھیں اور اب مغرب کی نماز پڑھ کر وہ کافی دیر سے فارغ بیٹھی تھی۔ ان کی آمد کا دور دور تک پہنچ نہ تھا۔

اس کی پریشانی بڑھانے والی عمل تھا۔ اس نے چادر اوڑھی اور دروازے پر باہر سے کنڈی لگا کر برابر فاخرہ کے گھر سے انا بی کو بلانے پہنچ گئی۔

وہاں فاخرہ نے بتایا کہ انا بی صبح کچھ دیر کے لئے آئی تھیں پھر دوبارہ نہیں آئیں۔ ان کے جواب نے اس کی پریشانی دوچند کر دی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ انہیں اب کہاں

دیکھے کہ محلے میں کسی سے اسے تعلقات نہیں تھے کہ وہ یوں اطمینان سے کسی کے گھر جا کر بیٹھ جائیں، جبکہ اس کی عادت کو جانتے ہوئے وہ کبھی زیادہ دیر بازار میں بھی نہیں لگتی تھیں کہ وہ پریشان ہو کر دروازے کے چکر کاٹے گی۔

اب کہاں چلی گئیں وہ؟

کہاں انہیں تلاش کروں؟

کس سے پوچھوں ان کے بارے میں؟

فاخرہ نے بہت رد کا کہ منہ میٹھا کر کے جائے گراہی پریشانی میں اس وقت اسے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ ان سے معذرت کر کے واپس گھر چلی آئی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں چلی گئیں، انہیں کدھر تلاش کرے؟ ابھی وہ یہی سوچ رہی تھی کہ اتانی سسکراتی ہوئی اندر آئیں اور اسے پریشان دیکھ کر بولیں۔

”ہاں مجھے یہی فکر تھی کہ تم دروازے کے چکر کاٹ رہی ہو گی۔ جلدی جلدی کرتے بھی یہ وقت ہو گیا۔“

”فاخرہ! باجی کے بچے بہت تنگ کر رہے تھے کیا آج؟“ وہ انجان بن کر بولی۔

”پہلے ایک گلاس ٹھنڈا پانی پلا دو۔ جڑواں بچوں کو سنبھالنا آسان کام نہیں ہوتا۔ ایک تو پہلو بھگی کی اولاد اور جڑواں۔ مزید ستم یہ کہ کوئی بزرگ نہیں ہے گھر میں۔“ انہوں نے پانی پیتے ہوئے بہرہ روی سے کہا اور قفل اس کے کہ وہ کچھ کہتی دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ اتانی کے پیچھے وہ بھی اوٹ میں کھڑی ہو گئی۔

”آپ آگئیں۔ شکر ہے، فاخرہ بہت پریشان ہو رہی ہے۔ اس نے کہا پوچھ کر آؤں آپ آئیں یا نہیں؟“ دروازے پر فاخرہ کے شوہر کھڑے تھے۔ انہیں دیکھ کر خضریٰ نے تیزی سے ان کا رنگ سفید پڑتے دیکھا تھا۔

”ہاں..... ہاں میاں! میں بھلا کہاں جاؤں گی۔“ پیچھے خضریٰ کو دیکھ کر وہ بوکھلا رہی تھیں۔

”خضریٰ! بہن بہت پریشان ہو رہی تھیں۔ وہ سمجھیں کہ شاید آپ ہمارے گھر پر ہیں

اور وہاں آپ کو نہ دیکھ کر وہ اندر بھی پریشان ہو گئی تھیں۔“

”فاخرہ کو سلام کہنا، بچوں کو پیار دینا۔ گل آؤں گی کہہ دینا فاخرہ سے۔“ ان کی حالت غیر ہو گئی تھی۔ گویا کسی چور کو موقع واردات پر ہی پکڑ لیا گیا ہو۔ فاخرہ کے میاں کے جاتے ہی وہ تیزی سے اندر کی کنڈی لگا کر پٹیس تو خضریٰ سے لگائیں چرا کر اندر بڑھ گئیں۔

گھر سے نکلے وقت وہ یہ بھول ہی گئی تھیں کہ اگر انہیں واپسی میں دیر ہو گئی تو وہ فاخرہ کے ہاں انہیں بلانے پہنچ سکتی ہے اور ان کا بھرم، ان کا راز، ان کی محنت لہجوں میں عیاں ہو کر رہی ہو جائے گی۔ اب کس طرح اسے سمجھائیں؟ کس طرح یقین دلائیں کہ وہ جو کر رہی ہیں، دونوں کی ہی مجبوری ہے۔

انہوں نے دل گرگتی سے سوچا اور فیصلہ کر لیا کہ اسے اب سچ بتا دیں۔ آج کل وہ گھر میں تھی اور نہ معلوم کتنے عرصے بعد اسے دوبارہ ملازمت ملے اور وہ روزانہ کیا کیا بیانے بنا سکتی تھیں۔ پہلے اس طرح ہوتا تھا، جہاں وہ گھر سے آفس جانے کے لئے نکلی، اس کے جانے کے کچھ دیر بعد وہ اپنا کام منٹا کر چلی جایا کرتی تھیں اور شام کو اس کے آنے سے قبل آ جایا کرتیں۔ اس طرح وہ کبھی محسوس ہی نہ کر پاتی کہ وہ روز گھر سے جاتی ہیں۔

اسے سچ بتانے کا ارادہ کیا تو دیکھا وہ کمرے میں نہیں ہے۔ وہ مہن میں نکل آئیں۔ امرود کے درخت کے نیچے چار پانی پر وہ دوپٹے میں منہ چھپائے روتی ہوئی نظر آئی۔ وہ تیزی سے اس کی جانب بڑھیں۔

”کیوں رو رہی ہو؟ کیا بات ہوئی میری بچی؟“ وہ اسے سینے سے لگا کر خود بھی رونے لگیں۔ مگر اس سے کچھ بولا ہی نہیں کیا۔ آنسو تو اترے بہہ رہے تھے۔

”کچھ بولو تو سہی، کیا ہوا؟“

”کہاں گئی تھیں آپ؟ سارا دن آپ کی واپسی کے انتظار میں گزر گیا۔ گھبرا کر فاخرہ باجی کے گھر سے آپ کو بلانے گئی تو وہ کہنے لگیں آپ سچ کچھ دیر کے لئے آئی تھیں اس

تیار ہو گئی۔

”اما بی! گل چہرے میں نے کچھ ایسے ایڈریس نوٹ کئے تھے جہاں ملازمت ملنے کی امید ہے۔ دعا کریں بہتر جاب مل جائے۔ مجھے واپسی میں دیر ہو جائے گی۔ آپ پریشان مت ہونا۔“

”اللہ تمہیں کامیاب کرے، اپنے حفظ و امان میں رکھے۔“ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر انہوں نے صدق دل سے دعا دی۔

”آپ وعدہ کریں مجھ سے۔“ وہ ان کا تحفہ و نذر ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولی۔

”کیسا وعدہ بیٹی؟“

”مجھے ملازمت مل جائے گی تو آپ نوکری فوراً چھوڑ دیں گی۔“

”یہ کیا بات ہوئی۔ یہ نوکری کیا دکھ دے رہی ہے؟“

”بہت بڑا دکھ۔ آپ نہیں سمجھتیں اما بی۔ آپ اس عمر میں بھی میری خاطر چند سو روپے کی خاطر کسی کی غلامی کر رہی ہیں۔ یہ احساس، یہ دکھ مجھے اندر ہی اندر کند چھری کی طرح گھاگل کئے دے رہا ہے۔ ساری زندگی آپ نے محنت کی، مشقت کی، خود کو مشین بنالیا۔ اب..... اب تو آرام کیجئے، زندگی کی راحت و مسرت پر کیا آپ کا کوئی حق نہیں ہے؟ ساری عمر یونی ورمیوں اور مشقتوں میں گزاریں گی؟“

”اچھی خاصی تو زندگی گزر رہی ہے میری بیٹی۔ بیکار سوچوں کو دل میں جگہ نہیں دیا کرتے۔ زندگی کی یہ خوشیاں، یہ آرام کیا کم ہے کہ ہم صرف اللہ کے محتاج ہیں۔ رب نے ہمیں ہاتھ پیر چلانے، دماغ استعمال کرنے کی صلاحیت دی ہے ورنہ ان لوگوں سے پوچھو کہ جو کسی وجہ سے ان نعمتوں سے محروم ہو جاتے ہیں تو دولت و ثروت حاصل ہونے کے باوجود ان مسرتوں سے محروم رہتے ہیں جو ہمیں حاصل ہیں۔ اور تم نے یہ کیا کہا کہ روپے کی خاطر میں کسی کی غلامی کر رہی ہوں؟ بہت غلط خیال ہے یہ۔ شاید تم یہ سوچتی ہو گی بلکہ تمہیں شرمندگی محسوس ہو رہی ہو گی یہ سوچ کر کہ میں باور چنی بی ہوئی ہوں، ان لوگوں کا کھانا پکاتی ہوں۔ میری بیٹی! محنت میں شرمندگی و شرمساری نہیں محسوس کرنی

کے بعد نہیں آئیں۔ یہ سن کر آپ کو لفظوں میں نہیں بتا سکتی کہ میری کیا حالت ہوئی۔“ اس نے بچکیوں کے دوران بتایا تو انہوں نے پیار سے اسے لپٹا لیا۔

”تمہیں چھوڑ کر کہاں جاؤں گی میری بیٹی! تمہاری خاطر تو زندہ ہوں۔“

”کہاں گئی تھیں آپ؟ اب آپ کو کچ بچا ہوا ہے۔“

”ہوں..... میں فیصلہ کر چکی ہوں سب کچھ سچ بتانے کا۔ مگر تم کو بھی وعدہ کرنا پڑے گا کہ میری بات سن کر خفا نہیں ہوگی اور نہ ہی دل کو لگاؤ کی۔“ وہ اس کے نزدیک بیٹھ کر بے حد نرمی و شفقت سے گویا ہوئیں۔ جواب میں اس نے کچھ نہیں کہا۔ خاموشی سے ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔

”میں ایک گھر میں کھانا پکاتی ہوں۔ بہت اچھی فیلٹی ہے، تنخواہ بھی مناسب ہے اور پریشان بھی نہیں کرتے۔ بہت عزت دیتے ہیں۔ دیکھو، اب تم خیال مت کرنا کہ میں نوکری کیوں کر رہی ہوں۔ حالات تمہارے سامنے ہیں۔ تمہاری ساری تنخواہ اور فاضل فیاض کو دے دیتی ہوں۔ پھر گھر میں رہنے کے لئے بھی تو رقم درکار ہوتی ہے۔ اس طرح میں نے سوچا، قرض بھی ہلکا ہو جائے گا اور سارا دن گھر میں فضاں گزر جاتا ہے تو کچھ حاصل ہی ہو جائے گا۔“

”اما بی! یہ بات آپ نے مجھ سے چھپائی کیوں؟“ اس کے ہونٹوں سے دھیمی آواز ابھری۔

”بس، اب کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک طرف پڑے پڑے تو لوہے کو بھی زنگ لگ جاتا ہے پھر میں تو انسان ہوں، اس طرح میرے ہاتھ پاؤں چلتے ہیں ورنہ بیمار بن کر رہ جاؤں۔ چلو اب پہلے کھانا کھاتے ہیں پھر نماز پڑھ کر سوئیں گے۔“ اپنے ساتھ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے بھی اٹھالیا تھا۔ خستہ کی کچھ بولی نہیں مگر اس کا سرخ پڑتا چہرہ اور دوبارہ چمکنی نگاہیں اس کے اندر چھوٹی بے چینی و ناپسندیدگی کا پتہ دے رہی تھیں۔

صبح نماز و تلاوت سے فارغ ہونے کے بعد نیند نہیں آئی تھی۔ اما بی ناشتہ بنانے لگیں، وہ اپنے اور ان کے کپڑے نکال کر پرہیز کرنے لگی۔ پھر ناشتے سے فارغ ہو کر

چاہئے۔ کسی کے آگے ہاتھ پھیلاتے سے بہتر ہے بندہ خود ہاتھ پیر چلائے۔ محنت کرنے والوں کی عزت ہوتی ہے۔“

انہیں پہلے سے احساس تھا کہ وہ ضرور مخالفت کرے گی۔ کیونکہ رات بھر اس کی بدلتی کمرٹوں سے وہ اس کا ذہنی اضطراب و بے چینی محسوس کر چکی تھی۔ انہیں معلوم تھا وہ کبھی بھی ان کی ملازمت کو پسند نہیں کرے گی لیکن گھر کے حالات اکیلے کے بس کے نہیں تھے۔ اگر مسئلہ صرف ان دونوں کا ہوتا تو خضریٰ کی تنخواہ سے یا آسانی گزارہ ہو سکتا تھا۔ مگر اصل گنہگار مسئلہ رافع فیاض کو وہ مخصوص رقم دینے کا تھا جو ہرماد کے شروع میں دینی ہوتی تھی۔ جو کبھی مجبوراً لیٹ ہو جاتی تو وہ بدتمیزی کرتا یہاں آکر۔ کم از کم جب تک اس کی رقم پوری ادا نہیں ہو جاتی تب تک وہ ملازمت نہیں چھوڑ سکتی تھیں۔

”آپ فیصلہ کر چکی ہیں کہ مجھے اسی طرح حائل کرنی رہیں گی؟“

”نہیں، ہرگز نہیں۔ میں ماں ہوں قصائی نہیں۔ اس وقت تمہاری ضد میں صرف بچکانہ پن ہے۔ جذبات کی دنیا سے باہر نکل کر دیکھو گی تو خود ہی وقت و حالات کی نزاکت کا احساس ہو جائے گا۔“ انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔

✽✽✽

”السلام علیکم ڈیڈی! کیسے ہیں آپ؟“ ناشے کی ٹیبل پر وہ ہشاش بھاش سا شاہ زیب صاحب سے مخاطب تھا۔ گل کی نسبت آج وہ کافی بہتر تھا۔ لباس بھی نیا تھا، شیوہ بھی ہوئی تھی، بال سلیپ سے سنوارے گئے تھے، چہرہ بھی خاصا فریش فریش لگ رہا تھا۔ مگر آنکھیں وہی مخصوص خزن و سوز میں ڈوبی ہوئی تھیں اور اس کے مسکراتے لبوں کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔

”بالکل دیا سہاں جیسا ایک زندگی سے لاپرواہ تاریکیوں سے عشق کرنے والے بیٹے کا باپ ہوتا ہے۔“ وہ آزرہ کی سے بولے۔

”اودہ! یہ کیا کہہ رہے ہیں ڈیڈی آپ؟ مجھ سے کوئی شکایت ہے آپ کو؟“ سلاٹس پر جیم لگاتا اس کا ہاتھ رک گیا۔

”نہیں، شکایت تو مجھے اپنے آپ سے ہے۔ کیوں تمہارے بہتر مستقبل کی خاطر میں دولت کے انبار لگانے میں اس قدر محو ہو گیا کہ بیٹے کی جانی کی طرف بڑھتے قدم روک نہ سکا۔ خرابیوں، خامیوں کو اپنی اعلیٰ سوسائٹی کے حقانے سمجھ کر نظر انداز کرتا رہا اور خود اپنے بیٹے کو جہنم کی طرف دھکیلا رہا۔“

”ڈیڈی! پلیز کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ کس طرح کی باتیں کر رہے ہیں؟ میں ٹھیک ہوں، بالکل فریش، بھلا مجھے کیا ہوا ہے؟“

”تمہیں کچھ ہوتا بھی نہیں چاہئے ورنہ.....“

”اودہ کم آن ڈیڈی! یہ کیا آپ بھی وہ منہ کی طرح ایسٹوٹل ہو گئے ہیں۔ کچھ نہیں ہوگا مجھے۔ ناشتہ کریں، بے مزہ ہو جائے گا تو کچھ نہیں کھا پائیں گے آپ۔“ اس نے مسکراتے ہوئے سلاٹس کی پلیٹ ان کی طرف بڑھائی پھر دانستہ ان سے اس انداز میں باتیں کیں کہ وہ انفرادی پریشانی بھول کر اس کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گئے۔ ناشتہ بہت خوشگوار ماحول میں کیا گیا تھا۔

ناشتے کے بعد شاہ زیب صاحب آفس روانہ ہو گئے۔ وہ اخبارات لے کر لیونگ روم میں بیٹھ گیا اور کافی دیر مطالعہ کرتا رہا۔ عارفین کی آمد نے اس کی اس مصروفیت کو ختم کیا تھا۔ اخبارات ایک طرف رکھ کر وہ اس سے مخاطب ہوا۔

”عارفین! ڈیڈی کل کمرے میں آئے تھے؟“

”جی ہاں۔“ اس نے قریب آکر سودبانہ لہجے میں جواب دیا۔

”ہوں، جب ہی آج اس قدر ڈسٹرب تھے۔ مجھے ذرا بھی یاد نہیں۔“

”صاحب! باہر فضلہ بی بی آئی ہیں۔ میں نے انہیں بہت دالنے کی کوشش کی مگر وہ کہتی ہیں جب تک آپ سے نہیں ملیں گی یہاں سے نہیں جائیں گی۔“

”میں، تمہیں معلوم ہے نا کتنی ضدی ہوں۔ جو کہتی ہوں وہ کرتی بھی ہوں۔ اور مجھے یقین تھا کہ تم اندر ہی ہو اس لئے میں نے آج واپس نہ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔“ شوخ مسکراہٹ ریڈ لپ اسٹک سے چمکتے ہونٹوں پر سجائے پُر اعتماد انداز میں وہ اندر داخل

ہوئی تھی اور بہت بے قراری سے اس کی طرف بڑھی تھی۔

عارفین وہاں سے چلا گیا تھا۔ شانزل نے نرمی سے اسے خود سے الگ کیا تھا۔

”ڈیئر! ناراض ہو؟“ فتنہ نے بہت حیرانی سے اس کی اس حرکت کو نوٹ کیا۔

”نہیں۔ تم سے ناراضگی کیسی بھلا؟“

”پھر.....“

”کچھ نہیں۔ بتاؤ کیا ہو گی؟“ اس نے مونے پر بیٹھتے ہوئے دانستہ موضوع چھیچھی

کیا۔

”جو تمہیں پتا ہو۔“ وہ ریڈ سائز می کا گولڈن ہارڈر پلو ایک ادا سے انگلی پر لپٹتی ہوئی

بولی۔ شانزل نے انٹرکام پر عارفین کو کولڈ ڈرنک لانے کا حکم دیا۔

”کہاں رہے اسنے دن؟ میرا تو انتظار کرتے کرتے برا حال ہو گیا تھا۔“

”ہوں..... لگتا تو نہیں۔ بلکہ مجھے تو پہلے سے زیادہ کیوٹ لگ رہی ہو۔“ اس نے

بغور اس کی جانب دیکھتے ہوئے شوشی سے کہا۔ گہرے گلے والے بغیر اسٹیجیوں کے

گولڈن بلاؤنز سے باہر اس کی گوری رنگت خوب دکھ رہی تھی۔ پیچنگ جیولری اور

مہارت سے کئے گئے میک اپ میں اس کے حسن کی شادابیاں عروج پر تھیں۔

”کبھی تو دل سے بھی تعریف کر دیا کرو ڈیئر۔“

”تم اتنی تعریف کی بھو کی کیوں رہتی ہو؟“

”سرف میں نہیں، بلکہ ہر لڑکی جی خواہش رکھتی ہے۔“

”کیا سب لڑکیاں ایسی ہوتی ہیں؟“

”ہاں۔“

”نہیں، شاید کچھ لڑکیاں ایسی نہیں ہوں۔“ اس کی نگاہوں میں ایک باوقار سرپا لٹے

محر کو لہرا کر غائب ہو گیا اور اس کے اندر اضطراب و بے چینی دوبارہ بیدار ہونے لگی۔

”کیا ہوا؟ تم ایک دم خاموش کیوں ہو گئے؟“ فتنہ نے اس کی بدلتی کیفیت شدت

سے محسوس کی تو فوراً دریافت کیا۔

”کچھ نہیں۔ لو، تم کو لڈ ڈرنک پیو۔“ اس نے عارفین کے ہاتھ سے گلاس لے کر اس

کی جانب بڑھایا اور اپنے گلاس سے سب کرنے لگا۔

”جلدی سے کپڑے چھین کر دو، ہم لٹچ اور ڈنر باہر کسی بہت اچھے ہوٹل میں کریں گے

اور رات.....“

”سودی فتنہ! میں آج بہت بڑی ہوں۔ کہیں نہیں جاسکوں گا۔“

”پھر کل کا پروگرام رکھ لیتے ہیں۔“ فتنہ کے لہجے میں تعجب تھا۔

”سودی..... شکل اور نہ پرہوں، بلکہ آئینہ کچھ بٹھتے..... بلکہ کچھ ماہ میں بہت بڑی

رہوں گا۔ اس لئے تمہیں ٹائم نہیں دے پاؤں گا۔“

”تو..... تو..... نو اسپا سبل۔ مجھے نہیں لگتا تم شانزل خان ہو۔ میں کیسے مان لوں تم

شانزل خان ہو؟ تم جو میرے ساتھ وقت گزارنے کے لئے ہر شے کو ٹھوکر مار دیا کرتے

تھے۔ میرے لئے تمہاری بزنس ایکٹوئیز کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھیں تمہارے لئے، آج

میں خود چل کر آئی ہوں تو تم مجھے بتا رہے ہو کہ تمہارے پاس ٹائم نہیں ہے میرے

لئے۔“ وہ غصے سے کھڑی ہو گئی۔

”میری بات سمجھنے کی کوشش کرو، ہر وقت موڈ یکساں نہیں رہتا، بدلتا رہتا ہے۔“

”تمہارا موڈ ہی نہیں بلکہ تم خود بدل گئے ہو اور اس حد تک کہ پہچانے نہیں جا

رہے ہو۔“

”بیٹھو نا، کہاں جا رہی ہو؟“

”جب تمہیں میری ضرورت ہی نہیں تو فضول ہے یہاں بیٹھنا۔“ اس نے خاصے

چلنے کے لئے انداز میں جواب دیا اور گیٹ کی طرف قدم بڑھا دیے۔

”اوکے، ایڈیووش..... عارفین! اس کو احرام سے گیٹ تک چھوڑ آؤ۔“ وہ فتنہ کو

جانے کا کہتا ہوا اپنے بیڈروم کی طرف بڑھ گیا اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا جہاں فتنہ اسے

اتنی حیرانی سے دیکھ رہی تھی گویا شبہ ہو اس کی دماغی حالت پر۔

”پندرہ دن ہو گئے ہیں! دفتروں کے چکر لگاتے ہوئے، ہر بار ناکامی ہوتی ہے۔ میں کہہ رہی ہوں کچھ دن گھر بیٹھ جاؤ، پھر دیکھ لیتا۔ دراصل یہ کچھ حیران کن بات ہے کہ جس چیز کی ہمیں جس وقت شدید ضرورت ہوتی ہے، اسی وقت ہماری آزمائش شروع ہو جاتی ہے۔“ انابی نے ناشہ کر کے تیار ہوتی خضریٰ کو خلوص سے مشورہ دیا تھا۔

”کبھی کبھی نہیں انابی! ہماری زندگی ہی آزمائش بن کر رہ گئی ہے۔ آزمائش اور آزمائش کے سلسلے کچھ اتنے دراز ہیں کہ زندگی کا معمولی سا بھی لطف ہم نہ اٹھا سکے۔“ اُس نے تیز ہاتھ چلا کر بالوں کو لپیٹ کر بینڈ لگائے تھے۔

”خوش نصیب ہیں ہم۔ اللہ اپنے پسندیدہ بندوں کو ہی آزمائش میں ڈال کر ان کے یقین و ایمان کی پختگی کا امتحان لیتا ہے۔ اس سے یہی دعا ہے کہ وہ ہمیں ہر آزمائش میں ثابت قدم رکھے۔ آمین۔“

”انابی، میں جا رہی ہوں۔ دعا کیجئے گا کامیاب لوٹوں۔“ وہ چادر اوڑھنے کے بعد بیک کاندھے پر ڈالنے ہوئے بولی تو حسب معمول انہوں نے بے تحاشہ دعاؤں کے ہمراہ اسے رخصت کیا۔

وہ طویل سفر طے کر کے کوچ کے ذریعے ڈرگ روڈ پہنچی جہاں ایک پرائیویٹ فرم میں ایک مینس کا ایڈ اُس نے کل دیکھا تھا۔

اندر داخل ہوتے ہی لے بھر کو اُس کا دل تیزی سے دھڑک اٹھا تھا۔ جس کے تصور سے بھی وہ نالاں تھی، وہ اندر سے نکل رہا تھا۔ دھنسن اور ساتھ تھے، دونوں کا انداز بتا رہا تھا کہ یقیناً وہ اُس کے ماتحت تھے۔ خضریٰ تیزی سے قریبی ستون کی اوٹ میں ہو گئی۔ شانزل ان دونوں کے ہمراہ کچھ فاصلے سے گزرا تھا۔

اُس کا اس طرح گزرنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ وہاں اس کی موجودگی سے بے خبر رہا تھا۔ وہ شکر کرتی ہوئی گیت کے نزدیک بیٹھے چیز اسی کی طرف بڑھ گئی۔

”سنیں بابا! وہ جو صاحب ابھی گئے ہیں، وہ یہاں کیوں آئے تھے؟“

”مجھے نہیں معلوم۔ میں یہاں آج ہی آیا ہوں۔ لیکن آپ کیوں معلوم کر رہی ہیں؟“

چونکہ امداد کے جواب نے اسے مطمئن نہیں کیا تھا۔ اس کے سوال کو نظر انداز کر کے وہ آگے بڑھ گئی۔ اندرو بال میں امیدواروں کی طویل قطاریں تھیں۔

وہ بھی نشست پر بیٹھ کر اپنی باری کا انتظار کرنے لگی۔ آدھے گھنٹے بعد فیئر صاحب نے معذرت کر لی یہ کہہ کر کہ کچھ تاخیر وجوہات کے باعث انٹرویوز کینسل کر دیے گئے ہیں۔ جلد دوبارہ کئے جائیں گے اور اس کی اطلاع اخبارات میں دے دی جائے گی۔ چند ہی معذرتی جملے کہہ کر فیئر وہاں سے چلا گیا۔ چند لمحوں میں جو ماحول پُر سکوت تھا یکدم ہی مختلف آوازوں سے گونج اٹھا۔

”بے حس و سنگدلی کی انتہا ہے۔ پہلے انٹرویو کے لئے بلاتے ہیں پھر فنیوئل جھوٹی معذرت کر کے اسی طرح بھگا دیتے ہیں۔ ہمارے وقت اور پریشانی کا کوئی احساس نہیں ہے۔“ کسی کی آواز ابھری۔

”یہ سب دکھاوا ہوتا ہے۔ سیٹ تو پہلے ہی رشوت کے ذریعے فروخت ہو جاتی ہے۔“

”پہلے والدین ہماری اعلیٰ تعلیم پر خرچ کرتے ہیں پھر ان نوکریوں کے چکر میں جھینس خالی ہو جاتی ہیں۔“ وہ سب باتیں کرتے باہر نکل رہے تھے۔

خضریٰ بھی یو جھل قدموں سے چلتی ہوئی باہر نکل آئی۔ کتنی پُر امید اور پُر جوش ہو کر وہ آئی تھی کہ شاید آج نصیب جاگ جائیں اور کچھ تو سیدہ سحر اس کی زندگی میں نور پیدا کرے۔ مگر وقت خواہشوں اور سوچوں کے تابع نہیں ہوتا، اس کا الگ شاہانہ مزاج ہے۔ مہیت اختتام پذیر تھا۔ اُسے فکر تھی اگر رائف فیاض کو روپے نہ بھیجے گئے تو وہ شخص گھر پر چلا آئے گا۔ پھر بھلا اس کی زبان کو کون لگام دے سکتا ہے؟

وہ اپنی سوچوں میں گم چلی جا رہی تھی۔ معا آف وہ اسٹ چھاتی کار نے تیزی سے آ کر اُس کا راستہ بلاک کر لیا تھا۔ اُس نے گھبرا کر دیکھا تو ڈرائیو جگ ڈور سے جھانکتے منکراتے ہوئے شانزل کو دیکھ کر اس کی پیشانی پر ناگواری کی سطوریں پڑ گئیں۔

”یہ کیا بدتمیزی ہے؟“ اُس نے سخت لہجے میں کہا۔

”سوری..... آؤ میں ڈراپ کر دوں گا۔“

”تو جھٹکس۔۔۔ میں چلی جاؤں گی۔“

”انکار نہیں کرو، پچھلے ایک گھنٹے سے یہاں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“

”کیوں؟ کس نے کہا تھا؟“

”دونوں سوالوں کا ایک ہی جواب ہے۔ میرے دل نے۔ مانتی ہونا میری باریک بین نگاہوں کو؟ تم تو خود کو ستون کے پیچھے روپوش کر چکی تھیں مگر بھول گئیں کہ ہم بھی قیامت کی نگاہ رکھتے ہیں۔“ وہ اُس کی سرد مہری کو نظر انداز کئے مسلسل خوشگوار بات سے بات کر رہا تھا۔

”جی، میں بخوبی آگاہ ہوں آپ کی ان تمام خصوصی ”صلاحیتوں“ سے۔ اب برائے مہربانی مجھے جاتے دیں۔“ اُس کا خطرہ لہجہ عاجزانہ ہو گیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اُس کی عقابانی نگاہوں کو کوس رہی تھی کہ احتیاط کے باوجود وہ اسے کھوج چکی تھیں اور وہ بہت چالاکی سے یہ بھی جان چکا تھا کہ وہ اسی راستے سے گز رہے گی۔

”آپ اتنی غیریت برت کر مجھے رنج پہنچا رہی ہیں۔ کیا ہمارے درمیان دوستی۔۔۔“

”ہمارے درمیان کوئی دوستی کا رشتہ نہیں ہے۔“ وہ اس کی بات قطع کر کے چیخی۔

”میرے خیال میں دشمنی کا رشتہ بھی نہیں ہے۔“ اُس کی دلکش مسکراہٹ بدستور گہری تھی۔

”دوستی یا دشمنی کا رشتہ کسی تعلق کی بنا پر بنتا ہے۔ ہمارے درمیان ایسا کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”میں تو تعلقات استوار کرنے کی ہر سعی کر کے شکست کھا چکا ہوں، اب تم ہی کوئی راہ بتاؤ۔“

”مضمحل ہے ہر کوشش، ہر چال، ہر مکاری۔ یہ بات آپ اچھی طرح جان چکے ہیں کہ میں آپ کی ہوس کا شکار ہونے سے قہری موت کا شکار ہونا پسند کروں گی۔“ خضرئی کے سرد اور مضبوط لہجے پر اس کی مسکراہٹ یکدم ہی بجھ کر رہ گئی۔ آنکھوں میں عجیب سا حزن پھیلا چلا گیا۔ چہرے پر تاسف اور شرمندگی کے رنگ ابھرنے لگے تھے۔

”جو شخص اپنے خمیر کی سزا پہلے ہی بھگت رہا ہو، اسے مزید گھائل مت کرو خضرئی!“

”مگر آپ کا خمیر زندہ ہو گیا ہے تو یقیناً آپ کو اچھائی، برائی، نیکی اور بدی کا فرق بھی محسوس ہونے لگا ہوگا۔ اور اس وقت میری پوزیشن یہاں اس طرح کھڑے ہونے سے کس طرح متاثر ہو رہی ہے آپ اچھی طرح سمجھ رہے ہوں گے۔ پلیز مجھے جانے دیں۔“

خضرئی کی حساس نگاہوں سے اُس کی بدلتی کیفیت جس میں ندامت، شرمندگی اور تاسف تھا، پوشیدہ نہ رہ سکی تھی۔ اُسے خیرانی تو ہوئی مگر یہ لہجہ تھا اس سے نجات حاصل کرنے کا۔

”مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ پلیز، میں تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ میرے ساتھ چلی چلو۔ پلیز۔۔۔ پلیز ایسی کوئی بات نہیں ہے جو تم سمجھ رہی ہو۔“ اُس کے چہرے پر پھیلنے لڑو کے سائے دیکھ کر وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

”میں بہت مشکل میں ہوں۔ پلیز آپ میری مشکلات مزید نہ بڑھائیں۔ مجھے کوئی بات نہیں سننی۔“ وہ اُس کی کسی بات پر اب یقین کرنے کو تیار نہ تھی۔

”صرف ایک بات۔ خدا گواہ ہے میری نیت میں کوئی کھوٹ یا بددیانتی نہیں ہے۔ میں صرف تم سے اپنے گزشتہ رویے کی معافی مانگنا چاہتا ہوں“ اُس کی نگاہوں میں ایک کرب آمیز ڈکھلکھورے لینے لگا۔ سرخ انگارہ آنکھوں میں ڈکھ بھرنے لگا تھا۔ ایک عالم کو اپنا تابع بنانے والا وہ خود سر، سنگدل، سرکش و ضدی شخص اس لمحے اس فقیر کی طرح کھڑا تھا گویا زندگی بھر اس کے کھکول میں کسی نے کوئی مکہ نہ ڈالا ہو۔ اپنی تمام آکر، برتری و مردانگی کا گھمنڈ بھول کر اس کے سامنے ایک ٹوٹے، بکھرے، شکست خوردہ شخص کی ایسی عاجزی و بے چارگی نے اسے اندر ہی اندر لرزایا ڈالا تھا۔ وہ کیا تھا اور کیا ہو گیا تھا۔

ناٹ فارسیل چیزوں کو خریدنے والے بندے کی حالت از حد دگرگوں تھی۔ وہ خاموشی سے کار میں فرنٹ سیٹ پر آکر بیٹھ گئی۔ اُس نے جھٹکس کہتے ہوئے کار اشارت کر دی۔ کار شفاف سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ دونوں کے درمیان خاموشی تھی۔

”کیا تم مجھے معاف کر سکتی ہو؟“ وہ کچھ دیر بعد سنجیدہ بھاری آواز میں بولا۔

وہ قصدِ خاموش رہی۔ شانزل کا رویہ اس کے لئے عجیب تھا۔

”جو کچھ میں نے کیا، اس کے لئے معافی، معذرت و شرمندگی بہت ہی چھوٹے لفظ

ہیں اور شاید بے معنی و بے وقعت بھی۔ نذا گواہ ہے، میں سچے دل سے معذرت مانگ

رہا ہوں۔ مجھے معاف کر دو۔ جب سے گھر آیا ہوں میرا سکھ، چین، آرام و سکون سب

کچھ مجھ سے روٹھ گیا ہے، کھو گیا ہے۔ نہ مجھے راتوں کو نیند آتی ہے اور نہ دن کو قرار.....“

وہ بولتے بولتے جیسے تھک گیا تو لمحے بھر کو خاموش ہو گیا۔ اس کا شخص تیز تھا اور خضریٰ

نے محسوس کیا کہ اس تمام عرصے میں اسے مسلسل وحشی کھانسی آتی رہی تھی۔

”ان دو ہفتوں کے عرصے میں نیند کو ترس گیا ہوں۔ سکون کی تلاش میں سرگرداں

ہوں۔ میرے ساتھ ایسا کبھی نہیں ہوا۔ بہترین ڈاکٹرز، اعلیٰ ترین میڈیسنز کوئی مجھے

سکون نہ دے سکا۔ میرے اندر کوئی پکارتا ہے کہ میں نے خضریٰ حیات کے ساتھ زیادتی

کی ہے۔ اسے بہت ذہنی تکلیف اور بے سکونی دی ہے۔ اور شاید مجھ سے ڈر کر خوف و

فکر کے باعث تمہاری نیندیں بھی خراب ہوئی ہوں گی۔ ہر لمحہ، ہر گھڑی بے سکونی و بے

چینی کے کرب میں مبتلا رہی ہوگی۔ مجھے اپنے کئے کی سزا مل ہی ہے، مکافاتِ عمل کا

شکار ہو گیا ہوں میں اور اس عذاب سے نجات، اس سزا سے خلاصی مجھے تب ہی ملے گی

جب تم مجھے معاف کر دو گی۔ پلیز مجھے معاف کر دو۔ تم نے درست کہا تھا کہ کچھ لوگ

حاکمیت و دولت کے گھمنڈ میں خود کو بخیر رکھنے لگتے ہیں۔ اور کہتے حقیر و بے وقعت

ہوتے ہیں جب ذرا سے جھکے سے عرش سے فرش کی خاک چائے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔“

”آپ اللہ سے معافی مانگتے رہئے۔ رب سے توبہ کیجئے۔ ذہنی سکون و راحت سچی

توبہ میں ہے۔ جب بندے اللہ سے ڈرنا چھوڑ دیتے ہیں، توبہ کی راہ نہیں لپاتے تو اسی

طرح ذلیل و خوار ہوتے ہیں۔ اسی طرح سکون، راحت، چین اور سرتوں کو ترستے

ہیں۔ آج کل جہاں بھی نگاہ ڈالتے ہیں، مسلمانوں کو غیر مسلموں کے جبر و ظلم کا شکار

دیکھتے ہیں، یہی وجہ ہے۔ میں بھی کوئی۔ بے گناہ اور اتنی اعلیٰ درجے کی مسلمان نہیں ہوں

کہ میری وجہ سے کسی کو سزا کا مستحق ٹھہرایا جائے۔ جو کچھ ہوا میں بھول چکی ہوں اور آپ

بھی بھول جائیں اور عہد کریں کہ آئندہ کسی مجبور کی مجبوری سے ہرگز فائدہ اٹھانے کی

کوشش نہیں کریں گے۔“

شانزل کی آواز میں ایسا سوز اور ایسی تشنگی تھی کہ اسے یقین آ گیا جو وہ کہہ رہا ہے، وہ

سچ ہے۔ وہ اپنے کئے پر نادم ہے۔ حقیقی معنوں میں شرمندہ ہے۔ کچھ دن کے اس کے

ساتھ نے یہ تو اسے باور کرا دیا تھا کہ وہ جو کچھ بھی کہتا ہے، دونوں اور سچ بات ہوتی

ہے۔ اس وقت اس کی حالت اتنی ہی دگرگوں اور قابلِ رحم تھی۔

”اس کا مطلب ہے تم نے مجھے معاف کر دیا؟“ وہ پُر اشتیاق لہجے میں بولا۔

”میں نے کہا نا آپ اللہ سے معافی مانگیے، میں تو خود گنہگار بندگی ہوں۔“

”ہاں..... ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے۔ لیکن ایک بار کہو تم نے مجھے معاف کر دیا۔“

”آپ بے مقصد ضد کر رہے ہیں۔“ اس کے اچھے انداز نے خضریٰ کو ہراساں

کر ڈالا۔

”میں ضد نہیں کر رہا، درخواست کر رہا ہوں، التجا کر رہا ہوں، بلکہ بھیک مانگ رہا

ہوں۔ مجھے یقین ہے آپ معاف کر دیں گی تو اللہ بھی مجھے معاف کر دے گا۔“ اس کا

لہجہ جینگا ہوا تھا۔

”میں نے معاف کیا آپ کو۔ اللہ بھی آپ کو معاف کر دے۔“ خضریٰ نے آہستگی

سے کہا۔

”تھینکس..... تھینکس اے لوٹ خضریٰ۔“ اس کا لہجہ مسرت سے کانپ رہا تھا۔

”مجھے یہاں اتار دیں۔“ اس نے سامنے اسٹاپ کی طرف اشارہ کیا۔

”اوکے۔ لیکن میری استدعا ہے تم سے اگر پوری کر دو تو مہربانی ہوگی۔ دراصل میں

چاہتا ہوں تم مجھے کوئی مشورہ دو۔ ایسا مشورہ جو میرا لائف اسٹائل بدل کر دکھائے۔ میں

اس ماحول سے الگ ہو گیا ہوں۔ یہ سچ ہے تم سے ملنے سے تم میری زندگی مجھے کبھی

کھوکھلی اور بے معنی نہیں لگی تھی۔ لیکن اب دل چاہتا ہے کوئی ایسا ضرور ہے جسے دیکھ کر

زندگی، زندگی تھے۔

”آپ شادی کر لیجئے، کسی ایسی لڑکی سے جو آپ کو بہت چاہتی ہو۔“ اس نے بہت غلوں سے مشورہ دیا اور ساتھ ہی اسٹاپ پر اتر گئی۔ پیچھے مڑ کر شانزل کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ مگر وہاں اس وقت تک کھڑا باجپ تک وہ کوچ میں چلی نہ گئی۔

”شانزل کہاں ہے؟“ شاہ زیب عارفین سے مخاطب ہوئے۔

”اپنے بیکروم میں سو رہے ہیں صاحب۔“

”اس وقت؟“ انہوں نے رست ولاق میں ٹائم دیکھا۔ ”معلوم بھی ہے لچ کا وقت ہو رہا ہے۔“

”مجھ نے صاحب تاکید کر کے سوئے تھے کہ ان کو اٹھایا نہ جائے، وہ خود جاگ جائیں گے۔ بہت دنوں بعد ابھی خند سونے جا رہے ہیں۔“ عارفین نے شانزل کے الفاظ دہرائے۔

”نہ معلوم کیا ہو گیا ہے اس لڑکے کو؟ میں بہت پریشان رہنے لگا ہوں۔“ وہ پریشان سے صوفے پر بیٹھ گئے۔ ان کے پُر دقار چہرے پر اداسی اور تپکر چھایا ہوا تھا۔

”مجھے لگتا ہے صاحب! یہ سارا معاملہ اس خضریٰ نامی لڑکی سے تعلق ضرور رکھتا ہے۔ میں نے ہر ممکن کوشش کر لی یہ جاننے کی کہ خضریٰ نامی لڑکی کہاں ہے مگر معلوم نہ کر سکا۔ لیکن یہ بات لازمی ہے کہ وہ لڑکی صاحب سے جیسی نہ رہتی ہے جب وہ پچھلی بار کراچی سے باہر گئے تھے اور واپسی میں اس کا ہی کوئی روگ لگا کر لائے تھے۔“

”روگ؟ کیا بکواس کر رہے ہو۔“ شاہ زیب سخت لہجہ میں گیا ہوئے۔

”معافی چاہتا ہوں صاحب! مگر میں بالکل سچ بتا رہا ہوں۔ چھوٹے صاحب ان دنوں بہت زیادہ ڈر تک کرنے لگے ہیں اور سگریٹوں کا تو کوئی حساب ہی نہیں اور مدہوشی کے عالم میں روتے ہیں، گڑگڑاتے ہیں، معافیاں مانگتے ہیں خضریٰ نامی لڑکی سے۔ اور بھی نہ معلوم کیا کیا کہتے ہیں۔“ عارفین نے دیے لہجہ میں اطلاع دی۔

”اور مائی گاڈ! کون ہے یہ خضریٰ؟ کسی آسیب کی طرح میرے بچے سے چٹ مٹی ہے۔ کچھ کرنا پڑے گا۔ ضرور کچھ کرنا ہوگا۔ میں اپنے بچے کو اس طرح چاہتے نہیں دیکھ سکتا۔ ان لڑکیوں سے معلوم کرنے کی کوشش کرو جو شانزل سے ملے آتی ہیں۔“

”اب تو سوائے فضا بی بی کے اور کوئی نہیں آتی۔ صاحب نے سب سے ملنے سے منع کر دیا ہے، کسی سے نہیں ملے۔ صرف فضا بی بی اکثر چلی آتی ہیں اور وہ اس سے بھی نہیں ملے۔“

”شانزل کے ساتھ نور محمد گیا تھا۔ اسے بلا کر معلوم کرو۔ وہ یقیناً جانتا ہوگا۔“

”نور محمد تو چھٹیاں لے کر اپنے گاؤں گیا ہوا ہے۔“

”اُس کی چھٹیاں منسوخ کرو اور فوراً بلاؤ۔“ انہوں نے تھکسانہ لہجہ میں کہا۔

تار کی کتھی ہی دبیز کیوں نہ ہو مگر روشنی کی نغمی سی کرن اس کا وجود ختم کر ڈالتی ہے۔ اس نے شانزل خان کی نگاہوں میں ایسی ہی کرن دیکھی تھی۔ شاید کوئی لمحہ قبولیت کا اس کی زندگی میں در آیا تھا جو اس جیسے بدکردار اور آوارہ مزاج کو ہدایت و ایمان کی حیات افروز ضیاء بخش گیا تھا۔ آج اس بد دماغ اور سر پھرے شخص کا کیسا رویہ دیکھا تھا اس نے کہ ابھی تک اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ سچ سچ شانزل خان ہی تھا۔

ہاں، وہ اتنا برا نہیں تھا جتنا نظر آتا تھا۔ خاصا وقت اس کی سنگت میں اس نے گزارا تھا۔ اگر وہ اتنا ہی گرا ہوا اور ادبائش فطرت ہوتا تو اپنی خواہش کی تکمیل کبھی بھی کر سکتا تھا۔ اور کیسے کیسے موتے نہ ملے تھے اُسے، اگر وہ چاہتا تو کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ یہ ضرور تھا کہ کئی مرتبہ ذومستی جملوں سے اس نے اس کا خون ضرور خشک کیا تھا۔ کبھی نگاہوں کی بے باکیوں نے بلا ڈالا تھا۔ مگر یہ سب ایک حد تک تھا۔ اس کی عصمت کا تقدس اس نے ہر آن ٹھوٹ دیکھا تھا۔ ایسے شخص کو وہ صدق دل سے معاف کر چکی تھی۔ اب اس کے من میں کوئی کدورت و نفرت نہ تھی۔ بلکہ طبیعت بہت فریاش ہو گئی تھی۔ ایک خوف تھا جو ہر دم رہتا تھا، زائل ہو گیا تھا۔

وہ جب سے آئی تھی شانزل خان کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس لئے انابی کی خاموشی کی طرف توجہ نہ دے سکی۔ اب اپنی سوچوں سے چھٹکارا ملا تو ان کی خاموشی محسوس کی۔

”انابی! کیا بات ہے؟ آپ پریشان لگ رہی ہیں۔“ وہ ان کے قریب بیٹھ گئی۔
”ملازمت چھوٹ گئی۔ وہ لوگ کل ملک سے باہر جا رہے ہیں۔“ وہ افسردگی سے بولیں۔

”اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ اچھا ہوا خود ہی یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔“
”بوش کے ناخن لونجی۔ مینے کا آخر چل رہا ہے۔ دو تا مراد بد بخت کبھی بھی آدھکے
مجھ کہاں سے دیں گے اسے روپے؟ وہ تو انریل ٹیو بن کر بیٹھ جائے گا۔“
”آپ فکر مت کریں، کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔“ اس بات کو وہ بھی سوچ رہی تھی مگر انابی کو تسلی دینے کی خاطر مسکرا کر بولی اور ابھی انابی بھی کوئی جواب نہ دے پائی تھیں کہ رافع فیاض دستک دے کر اندر چلا آیا۔

”ارے واہ! اب تو دروازہ کھلا رکھنے لگی بنو۔ کیا چکر ہے؟“ وہ اندر آ کر خباثت سے مسکراتے ہوئے بولا۔

”چکر و کر کیا میاں! پڑوس سے بچہ آیا تھا وہی کیا ہے ابھی۔ ہم کنڈی چڑھانا بھول گئے۔“

”پڑوس سے بچے ہی آتے ہیں یا۔۔۔۔۔“

”نالتو بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ شرافت سے بیٹھ جاؤ۔“

”خضرئی رانی! اب مہر کا بیان لیریز ہو چکا ہے۔ بہت مہر کر چکا۔ اب تو مجھے میرا روپیہ چاہئے۔ ابھی اسی وقت۔ کوئی بہانہ، کوئی جواز نہیں سنوں گا۔ اور کان کھول کر سن لو، میں کہیں جانے والا نہیں، سیکس ڈیرے ڈالے رکھوں گا۔“ وہ آرام سے نیم دروازہ بنو کر بولا۔

”ارے میاں! دماغ درست ہے تمہارا؟ جو منہ میں آتا ہے، بگ دیتے ہو۔“

”مجھے آنکھیں دکھانے کی ضرورت نہیں ہے بڑھیا! آج فیصلہ کر کے جاؤں گا۔ یا تو میری قرض کی رقم دو فوراً یا پھر۔۔۔۔۔ خضرئی کو لے کر جاؤں گا۔ ویسے بھی سال ہونے کو ہے۔“

”خضرئی کو بھول جاؤ میاں! روپیہ تمہیں دیں گے۔ کوئی بھوکے تھوڑی جا رہے ہیں ہم؟“ انابی غصے سے گویا ہوئیں جبکہ خضرئی کسی گہری سوچ میں مستغرق تھی۔ انابی اور رافع فیاض کی خوب بحث ہو رہی تھی۔ وہ کسی طور پر واپس خالی ہاتھ نہ جانے کو تیار نہ تھا جبکہ انابی اسے قائل کرنے کی سعی میں سرگرم عمل تھیں۔ مگر ان کے دلائل، ان کی یقین دہانیاں، ان کی مالی پوزیشن کی طرح خالی دکھائی تھیں۔ رافع کہاں بھل جاتا۔
”میں تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔“ کافی دیر بعد جب ان دونوں کی بحث دیواروں سے باہر پرواز کرنے لگی تو وہ سپاٹ اور مضبوط لہجے میں بولی۔ وہ دونوں ایک دم خاموش ہو گئے۔

”جت۔۔۔۔۔ تو۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔ سچ کہہ رہی ہو؟“ وہ حیرت و مسرت سے بولکھٹا اٹھا۔

”نہیں۔ دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا؟“ انابی سخت لہجے میں گویا ہوئیں۔

”نہیں انابی۔ یہ سچ ہے۔ میں رافع فیاض کو اپنا شوہر قبول کر لوں گی۔“

بہار

رائع فیاض جس سرگویا ہوا۔ "شوہر تو میں تمہارا ہوں۔ بس تمہاری ضد اور ہٹ دھرمی کے باعث سب کر رہا تھا۔ اب اگر تم راہ راست پر آگئی ہو تو میرے لئے اس سے زیادہ خوشی کی بات کیا ہو سکتی ہے۔" از حد خوشی سے اس کی باجیس کھلی ہوئی تھیں۔

"خضریٰ! کیا ہو گیا ہے بچی، کیوں اول نول بک رہی ہو؟ یہ آدمی اس قابل نہیں ہے کہ اس سے کسی بھلائی کی توقع کی جاسکے۔ کیوں خود کو مصیبت میں ڈال رہی ہو؟" انابی اس کی از حد بے نیکی و اضطراب کو دیکھ کر سخت متحوش تھیں۔

"انابی! جب مصیبتوں میں ہی زندگی بسر کرنی ہو تو پھر کسی ایک مصیبت کا انتخاب بہتر ہے، بلکہ دانش مندی ہے۔" اس کے سنجیدہ لہجے میں سکون سا دور آیا تھا۔

"ہے تو بہت نامعقول نام، مگر تمہاری طرف سے ملا ہے تو دل و جان سے قبول ہے۔" رائف فیاض خود کو "مصیبت" کا خطاب دینے پر خاصا سرور نظر آ رہا تھا۔

"بے غیرت و بے ضمیر لوگوں کی یہی نشانی ہے کہ گالی کو بھی اعزاز سمجھتے ہیں۔ اب یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ۔ کسی خوش فہمی کو دل میں جگہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی خضریٰ بیٹی کا دماغ ٹھکانے پر نہیں ہے۔ جب ہوش میں آئے گی تو لاکھ بار لعنت بھیجے گی تم جیسے جوئے، مکار آدمی پر۔" اس وقت رائف فیاض کا وجود انہیں ایک آنکھ نہ بھرا رہا تھا سو خاصی بد لحاظی سے وہ اس سے مخاطب تھیں۔

"انابی! پلیز غصے نہ ہوں۔ اور رائف فیاض، آپ دو دن بعد تشریف لائیے گا، تب تک میں انابی کا غصہ ٹھنڈا کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گی۔" وہ قصداً سسکا کر گویا ہوئی۔

"جو حکم سرکار آپ راضی ہو گئی ہیں، اب ہمیں کسی کے غصے کی پروا نہیں۔ دو دن

بعد آؤں گا آپ کو ساتھ لے جانے کے لئے۔ تیار رہے گا۔" وہ سرور سا چھوٹا چلا گیا اور انابی غصے سے اٹھ کر اندر کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ خضریٰ کی جانب انہوں نے دیکھا بھی نہیں تھا۔

نور محمد، مالک کے بلاوے پر فوراً ہی چلا آیا تھا اور ان کے سامنے اس کی ذرا جرات نہ ہوئی کہ کسی بات سے پہلو تہی کرتا کیونکہ ان کا لہجہ اور انداز اتنا سخت تھا کہ وہ ان کے ہر سوال کا جواب سچ سچ دیتا گیا جو وہ خضریٰ اور شانزل کے بارے میں جانتا تھا۔

"یہ کس طرح ممکن ہے کہ اس لڑکی نے شانزل کی ذرا پروا نہیں کی اور شانزل اس کے پیچھے اس حد تک پہنچ گیا کہ آج خود سے پیچ نہ ہے اور وہ لڑکی ہر سو اس کو دکھائی دیتی ہے۔ سوتے، جاگتے، چلتے، پھرتے وہ اس کے قصور میں چھائی رہتی ہے۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ لڑکی بے قصور ہے۔" نور محمد کے سچ سچ بتا دینے کے باوجود انہیں یقین نہ آ رہا تھا۔ ان کی فراخ پیشانی پر سلوٹھیں تھیں اور آنکھوں میں بے یقینی اور الجھن۔

"اگر آپ اجازت دیں تو ایک عرض کروں صاحب جی؟" نور محمد دھیسے لہجے میں بولا۔ "ہوں، کہو۔" شاہ زیب صاحب نے اس کی جانب بغور دیکھتے ہوئے اجازت دی۔

"شاید منہ چھوٹا اور بات بڑی محسوس ہو آپ کو۔ مگر ہم وہی کہیں گے جو سچ ہے۔ کیونکہ یہاں سوال چھوٹے صاحب کی زندگی اور خضریٰ بی بی کی عزت کا ہے۔ صاحب کے پاس جتنی بھی لڑکیاں آتی تھیں، ان کا پک اینڈ ڈراپ میری ذیولٹی تھی اور صاحب! ان لڑکیوں اور خضریٰ بی بی میں وہ فرق تھا جو دن کے اُجالے اور رات کے اندھیرے میں ہوتا ہے۔ وہ بہت باحیا اور ٹیک لڑکی تھی۔ شرافت اور پاکیزگی ان کی بد وقار شخصیت سے جھلکتی ہے۔ وہ بہت بلند کردار اور اچھی لڑکی ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ غریب ہونے کے باوجود انہوں نے کسی اپنی خوبصورتی کی قیمت نہیں لگائی۔ چھوٹے صاحب نے بہت کوشش کی تھی انہیں ہر طریقے سے خریدنے کی مگر انہوں نے اپنی عزت اور خود داری کا سودا ہرگز نہیں کیا۔"

”اچھا ٹھیک ہے، چاؤ۔“ انہوں نے اسے جانے کا حکم دیا تو وہ سلام کر کے چلا گیا۔ وہ اٹھ کر شانزل کے بستر روم میں چلے آئے جہاں وہ ارد گرد سے بے نیاز آنکھیں بند کئے کسی تصور میں غطاں تھا۔

”ہیلو مائی سن، یہ کیا حالت بنائی ہے؟“ بڑھا ہوا شیو، بکھرے بال، تلخ لباس اور بیمار زد چہرہ۔ جوان اور وجہ بیٹے کی حالت نے انہیں لرزادیا تھا۔ وہ کس راو پر چل پڑا تھا۔

”اوہ..... ڈیڈی! سو..... سو ری..... میں..... م.....“ باپ کو سامنے دیکھ کر وہ بولکلا کر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”کیا ہے یہ سب؟ نہ آفس آر ہے ہو اور نہ کسی سے ملتے، بات کرتے ہو۔ یہ سلسلہ کب تک چلے گا؟ کیوں مجھے پریشانوں کے مخرامیں جھکا رہے ہو بیٹے؟“

”آپ کیوں پریشان ہو رہے ہیں ڈیڈی۔ ست خود کو ڈپریشن کریں۔“

”یہ مجھ سے کہہ رہے ہو؟ باپ سے؟ میری ساری زندگی تمہاری نگر، تمہاری محبت میں گزری ہے۔ میری امیدوں اور خواہشوں کا آخری مرکز تم ہی ہو مائی سن۔ پھر کس طرح میں پریشان نہ ہوں؟ واپس لوٹ چلو اپنی دنیا میں میری جان۔ تمہیں کس چیز کی کمی ہے؟ کیا شے تمہیں میسر نہیں ہے؟ جب بھی تم نے کوئی فرمائش کی، میں نے ڈھیر لگا دیا ہے تمہارے سامنے۔ ہر وہ کچھ خرید کر دیا ہے جس کی تم نے چاہی ہے۔ پھر اب یہ سب کیا ہے؟“

”آپ نے مجھے سب کچھ دیا ہے، ہر فرمائش پوری کی ہے ڈیڈی! آخری فرمائش بھی پوری کر دیجئے۔ مجھے سکون خرید کر لاد دیجئے۔ بس اس کے بعد کوئی فرمائش نہیں کروں گا آپ سے۔“

”شانزل! کیا ہوا ہے؟ کیوں سکون کے سلاشی ہو؟ ایک بڑا آسائش لائف گزارنے کے باوجود تم بے سکون ہو؟“ انہوں نے تعجب و تکلیف سے جوان بیٹے کی سمت دیکھا جو بھری بہار میں خزاں رسیدہ درخت کی مانند نظر آ رہا تھا۔

”کس نے کہا ڈیڈی! سکون دولت اور بڑا آسائش زندگی میں ہوتا ہے؟“

”کبھی غربت اور کسبیر کی زندگی دیکھی ہوئی تو یہ سوال کبھی نہ کرتے۔ کبھی وہ دور دیکھا ہوتا جہاں ترس ترس کر انسان صرف ایک وقت کی روٹی حاصل کرتا ہے۔ وہ بھی آدھا پیٹ تو محسوس ہوتا پیٹ بھر کر کھانے کا سکون کیا ہوتا ہے۔ جہاں ہمدہ ساری زندگی محنت، کڑی مشقت میں گزار دیتا ہے اور عمر کے آخری ایام میں جب عمر کا تقاضا آرام و آسائش سے کچھ دن گزارنے کا ہوتا ہے اور پھر بھی نہیں گزار پاتا تو ان سے پوچھو کہ آسائش کیا معنی رکھتی ہیں۔“

”آپ ہر صحت مند ہوں ڈیڈی! مجھے صرف سکون کی تلاش ہے۔ مجھے نیند تو آتی ہے مگر سکون نہیں ملتا۔ میں نے ہر ممکن کوشش کر ڈالی ہے مگر بے سکون ہوں۔ مجھے سکون کی تلاش ہے۔ میں سکون چاہتا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم مجھے کیا ہو گیا ہے؟ کاش آپ مجھے سن میں کی بجائے کوئی مزدور ہوتے، ہمیں بیٹ بھر کر روٹی نہ ملتی، زندگی کی گاڑی کو اپنے ہاتھوں سے دھکیلاتا پڑتا۔ بے شک ہمارے لاکر ز دولت کے انباروں سے خالی ہوتے مگر سکون و طمانیت کی دولت سے مالا مال ہوتے ہم۔ ڈیڈی! آج اس تکلیف دہ، بے سکون اور گناہوں بھری زندگی سے تو میں پاک ہوتا۔ جن پرندوں کو پرواز کی قوت نہیں ملتی یا جن کے پر آغاز پرواز سے قبل توڑ کر پھینک دیئے جائیں تو وہ کبھی بلندی کی طرف نہیں بڑھتے، ہمیشہ پستی میں گرے رہتے ہیں۔“

”شانزل..... شانزل! تم ٹھیک نہیں ہو..... ٹھیک نہیں ہو۔ میں ابھی ڈاکٹر محمد کو بلا تا ہوں۔ تم مجھے میٹھی ڈسٹرب لگ رہے ہو۔“ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

”نہیں، میں ہوش میں تو اب آیا ہوں۔ پاگل تو پہلے تھا۔ آپ ڈاکٹر کو بلانے کی زحمت نہ کریں۔ میرا مرض لا علاج ہے۔“ اس نے ان کا ہاتھ پکڑ کر روک لیا تھا۔

”میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک حقیر لڑکی کی خاطر تم اپنے علاوہ میرے خیال، میرے آسائش، میری پرستش سب کو انکار کر دو گے۔“ اس بار ان کے لہجہ میں خمد و خضر تھا۔

”مختصری حقیر نہیں ہے ڈیڈی! وہی تو دولہ لڑکی ہے جس نے مجھے اس حقیقت سے

روشناس کرایا کہ میں کل تک اندھیروں کو اچالے کچھ کر چکی رہا تھا۔

”وہ بے وقعت اور غریب لڑکی جو کل تک ہماری فرم میں چند ہزار کی ملازمہ تھی، آج تمہارے لئے سب کچھ ہو گئی۔ ہاپ سے بھی زیادہ اہم؟ کتنی ہائی کلاس، ہائی اسٹیٹرز کی لڑکیوں سے تم ملے، ان سے دوستی کی، ان کے ساتھ وقت گزارا اور پسند بھی کیا تو ایک ایسی لڑکی کو جو نہ اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتی ہے اور نہ اچھے خاندان سے۔“

”عورت کی حیا اور پاکبازی ہی اس کا ہائی اسٹیٹرز ہوتا ہے۔ اور جن ہائی کلاس سوداگر نے والی لڑکیوں کی بات آپ کر رہے ہیں، بخوبی جانتے ہیں ان کے پاس کیا ہوتا ہے۔“

”میں تمہارا دشمن نہیں بننا۔“ اسے باغی ہوتے دیکھ کر وہ نرم روی سے گویا ہوئے۔
”اگر آپ میرے دشمن نہیں ہیں تو مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجئے اور کبھی بھی خضری کے متعلق ایسے لفظ استعمال مت کیجئے گا جو مجھے تکلیف پہنچائیں۔“ جیسی جیسی چلنے والی کھانسی اب شدت سے چلنے لگی تھی۔

”یہ دوستی اور میرے رہنے کا تقاضا نہیں ہے کہ میں تمہیں اس حال میں تنہا چھوڑ دوں۔ اگر تمہیں وہ لڑکی اتنی ہی عزیز اور پسند ہے تو میں اسے اپنی بہو بنانے کو تیار ہوں۔ مجھے لوگوں کی کبھی بھی پروا نہیں رہی۔ مجھے صرف اپنے اکلوتے بیٹے کی خوش عزت ہے۔“ اس کی از حد محبت اور دیگرگوں حالت نے بہت جلد انہیں ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ ویسے بھی وہ عام دولت مندوں کی طرح مغرور اور خود پسند نہیں تھے۔
”یہ ممکن ہی نہیں ہے ڈیڈی۔“ وہ پُرسوز سکراہٹ لبوں پر سجا کر بولا۔

”کیا مطلب؟“

”وہ شادی شدہ ہے۔ اور شاید اپنے ہسٹنڈ سے بہت محبت کرتی ہے۔“
”شادی شدہ ہے؟ پھر تمہاری یہ بے قراری، وحشت، جنون خیزی و اضطراب کیا سہی رکھتا ہے؟ یہ جانتے بوجھتے بھی کہ وہ ایک شادی شدہ لڑکی ہے، تم نے اس سے محبت کیا؟“ وہ سخت حیران و پریشان تھے۔

”محبت؟ یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ مجھے اس سے محبت ہے۔ جبکہ یہ میں خود نہیں جانتا کہ مجھے اس سے محبت ہے، عقیدت ہے یا۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔“ اس نے بالوں میں اضطرابی انداز میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔
”میرے خیال میں تم شادی کرنے پر راضی ہو جاؤ۔ جب انسان کو چھ چاہئے والے کی محبت ملتی ہے تو وہ سب بھول جاتا ہے۔“

”ہاں، میں نے بھی یہی کہا تھا۔ میں شادی کروں گا ڈیڈی۔ مجھے سکون چاہئے، آرام چاہئے۔ ایسی نیند چاہئے جس سے بیدار ہوں تو تازگی اور راحت کا احساس ہو۔“ وہ کھوئے کھوئے لہجے میں گویا ہوا تو شاہ زیب مذسوج نگاہوں سے اُس کی جانب دیکھتے رہ گئے۔ شادی کے نام سے بھی نفرت کرنے والا بندہ آج خود اقرار کر رہا تھا۔

”آپ نے کھانا پینا، مجھ سے باتیں کرنا کیوں چھوڑ دیا ہے انا بی؟ کیوں اپنے ساتھ مجھے بھی اذیت دے رہی ہیں۔ رافع فیاض کے ساتھ رہنے کا فیصلہ میں نے بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ آپ میری بات سمجھنے کی کوشش تو کریں۔“ وہ خاموشی اور ناراض بیٹھی انا بی کے قریب بیٹھ کر التجائیہ لہجے میں گویا ہوئی۔

”اب تم بہت عقل مند اور خود مختار ہو گئی ہو، بھلا میرے سوچنے سے کیا ہوگا؟“
”جیس، ایسا نہیں ہے انا بی۔ آپ مجھے دل و جان سے بڑھ کر عزیز ہیں۔ بچے بوڑھے بھی ہو جائیں تو اپنے بزرگوں کے لئے بچے ہی رہتے ہیں، نا سمجھ اور کم عقل۔ مگر انا بی اب کبھی کبھی ایسا بھی دور آتا ہے بلکہ وقت آتا ہے کہ چھوٹوں کو اپنی بالشت بھر عقل سے ہی بڑے بڑے فیصلے کرنے ہوتے ہیں۔“ اس کے لہجے میں بے چارگی و رانگی تو انہیں اس پر ترس آ گیا۔

”میری بچی! میں کہتی ہوں اتنی جلدی اپنے رب سے مایوس نہیں ہو جاتے۔ وہ بڑا رحم کرنے والا ہے۔ جلد میں اس آزمائش کی گھڑی سے نکال لے گا۔ کیوں ساری زندگی کے لئے اس منہوس، دغا باز کا ساتھ قبول کر رہی ہو؟ اُس ذلیل شخص نے اول روز سے

جھوٹ درجھوٹ بولے۔ تمہاری مرحومہ ماں پر تہمت رکھی کہ شادی کے لئے اس نے قرضہ لیا اور پھر ہر ماہ روپے لینے کے باوجود جھوٹ بولتا رہا کہ اس کے پاس کم سے کم رقم بچتی ہے۔ جو آدمی اپنی زبان کا پکا نہ ہو، اس سے آگے کیا امید رکھی جائے؟ جو لوگ بچے اور خلیص نہیں ہوتے، وہ کبھی بھی قابل اعتبار اور قابل بغور نہ نکلیں ہوتے۔“ انہوں نے پیار سے اُسے سمجھانے کی سعی کی مگر سمجھتے وہ ہیں جو سمجھنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنی پریشان کن زندگی سے اس حد تک بد دل ہو گئی تھی کہ اب اس شخص کے ساتھ زندگی گزارنے کا تجربہ کر چکی تھی جو کسی بھی اعتبار سے اس کے قابل نہ تھا۔

”جو اُس نے کیا، وہ خود بھگتے گا۔ کم از کم مجھے کمزور کرنے کی کوشش نہ کریں۔ ہم دونوں بغیر کسی سرو کے سہارے اس معاشرے کے گدے نما سردوں سے مقابلہ نہیں کر سکتے۔ قدم قدم پر ایسے لوگ ہماری راہ پر اپنی ناپاک آنکھیں کولے بیٹھے ہوتے ہیں۔“

”اور رخسانہ کا کیا ہوگا؟ وہ تمہیں کتنے دے گی؟ جس عورت نے پہلی رات ہی تم سے سارا زور لے کر، تمام سامان پر قبضہ جٹا کر خالی ہاتھ رات کی تاریکی میں تمہیں گھر سے نکال دیا تھا اب وہ اس کے مستند سے بھائی اور چند اہل ماں تمہیں رہنے دیں گے؟“

”بھائی! مجھے ڈر کی نہیں، دعاؤں کی ضرورت ہے۔ مجھے دعا دیں۔ کہیں تو میں سرخرو ہو جاؤں، کوئی گوشہ عافیت میرے لئے بھی ہو جہاں چند دن زندگی کے سکون سے گزر جائیں۔“

اسی دم دروازے پر دستک ہوئی۔ مخصوص دستک من کر خضرئی، انابی سے التجائیہ لہجے میں بولی۔

”پلیز انابی! رافح فیاض سے آرام سے بات کیجئے گا۔ اور آپ بھی ہمارے ساتھ چلنے کی تیاری کر لیں۔“

”نہیں بی، مجھے معاف کرو۔ خادع تمہارا ہے۔ تم ہی اس کے ساتھ جاؤ۔ میں یہاں رہ کر تمہارے لئے خوشیوں کی دعا کروں گی۔“ وہ اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھ گئیں۔

”شانی ڈارنگ! بولو، کیا کہنا چاہتے ہو؟ یہ پراسرار خاموشی مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی۔“ فتنہ نے اداسے دلربائی سے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر لاڈ بھرے لہجے میں کہا۔ وہ اس وقت سمندر کی ٹھنڈی ریت پر دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہے تھے۔ آتی جاتی لہریں ان کے قدموں کو چھو کر گزر رہی تھیں۔ موسم ابراہیم تھا، ماحول پر ایک دلکش سحر چھایا ہوا تھا۔

فتنہ پر اس موسم کا پورا پورا نشہ چڑھا ہوا تھا۔ ویسے بھی شانزل کو اس نے بہت عرصے بعد اپنی طرف لوٹنے دیکھا تو مسرت و شادمانی سے بے خودی ہو رہی تھی۔

گو کہ وہ پہلے کی طرح شوخ، بے باک اور بے قیود نظر نہیں آ رہا تھا۔ بہت بدل گیا تھا۔ جو نکا ہیں پہلے بے باکی سے اس کی جانب اٹھتی تھیں، اب تو جیسے وہ اس کی جانب اٹھنا ہی بھول گئی تھیں۔ عجیب کھویا کھویا بیگانہ انداز تھا اس کا۔ اب بھی وہ اسے ساتھ لے کر یہاں آیا تھا کہ کوئی ضروری بات کرنی تھی۔ مگر پچھلے ایک گھنٹے سے وہ خلاؤں میں نہ معلوم کیا کھوج رہا تھا کہ اس کی نگاہیں ارد گرد سے بے نیاز خلاؤں میں گم تھیں۔ چہرے پر اذ حد سنجیدگی طاری تھی۔ اس کی خاموشی کو دیکھ کر بالآخر فتنہ کو بولنا پڑا۔

”ہیوئی؟“ شانزل سرخ انکار و نگاہیں اُس کے خوبصورت چہرے پر ڈال کر بولا۔

”نہیں۔ دل و جان سے چاہتی ہوں تمہیں۔“ وہ خوشی سے گلہا ہو کر بولی۔

”کتنا چاہتی ہو مجھے؟“ فتنہ دوبارہ نوئی مگر لہجہ پائت اور احساسات سے عاری تھا۔

”کتنا جتنا کسی نے کسی کو بھی نہ چاہا ہو۔ تم میری روح میں بیٹے ہو شانی۔ میں پہلے دن سے تمہیں چاہتی آ رہی ہوں۔ مجھے یقین تھا میری چاہت ایک دن ضرور خود کو منوائے گی اور وہ خوش نصیب دن آج آ گیا۔ تمہیں احساس ہو گیا میری محبت کا؟“ وہ جذباتی لہجے میں کہتی ہوئی اس کے شانے سے لگ گئی۔

”چلیں۔“

”کہاں؟“

”گورٹ۔“

”کیوں؟“

”میرج کرنے۔“

”نو..... پو آرجوگ؟“ اس کے چہرے کی پھر ملی سنجیدگی اور لہجے کے ٹھوس پنا نے اسے حیرانی و پریشانی میں مبتلا کر ڈالا تھا۔ وہ حیرت سے بولی۔

”شادی مذاق تو نہیں ہوتی۔ دورشتوں کا بندھن، دودلوں کا ملن کس طرح غیر سنجیدہ بات ہو سکتی ہے ڈیر! میں سیریس ہوں۔“ اس کی سنجیدگی ہنوز برقرار تھی۔

”مگر کیوں؟..... کیا انکل راضی نہیں ہیں؟“

”نہیں۔“ اس نے اطمینان سے انکار کیا۔

”پھر ہم کورٹ میرج کیوں کریں؟ یہ کیسے ممکن ہے؟“

”مجھے سکون کی تلاش ہے۔ اور سنا ہے سکون اور سچی راحت سچے رفیق حیات کے وجود سے ملتی ہے۔ سو مجھے دنیا داری اور دکھاوے کی ضرورت نہیں ہے، صرف ایسے ساتھی کی تلاش ہے جو سکون و راحت دے۔ ظاہری نمود و نمائش بے جا دولت کا اصراف ہے جو کبھی بھی حقیقی مسرت نہیں دیتا غلبہ کو۔ مجھے تسکین چاہیے، ذہنی، روحانی و قلبی۔“ اس نے کھوئے کھوئے کرب آمیز لہجے میں کہا۔

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا، ایسا کس طرح ممکن ہے کہ اس ملک کے ہائی اسٹینڈرڈ سے.....“

”تمہیں سمجھ سے محبت ہے کہ میرے ڈیڈی کے اسٹینڈرڈ سے؟“ اس کی بات قطع کر کے وہ غصے سے گویا ہوا۔

”شائزل! جو بات تمہیں سوچنی چاہیے تھی، وہ میں سوچ رہی ہوں۔ تم اپنے ڈیڈی کے اٹکوتے بیٹے ہو، ان کی تمام جائیداد کے.....“

”سودی، میں تمہیں بتانا بھول گیا کہ میں اب ڈیڈی کی دولت و جائیداد سے کوئی تعلق نہیں رکھوں گا۔ خود محنت مزدوری کروں گا۔ اس دولت و جائیداد نے مجھے کہیں کا نہ

رکھا۔ میرا سکون، چین، کردار، وقار و شرافت سب داغدار کر دی۔“

”لوہ شانی! مجھے لگتا ہے تم سیکلی ڈسٹرب ہو۔ شاید بہت زیادہ ڈرنک کرنے لگے ہو جیسی اتنی ہلکی ہلکی باتیں کر رہے ہو۔“ فخر رنگ بدلتے چہرے سے اس کی جانب دیکھتی ہوئی حیرانی و فکر مندی سے گویا ہوئی۔

”درست ہے میرا دامخ، ہوش و حواس قائم ہیں میرے۔ مجھے یہ بتاؤ بغیر دولت و جائیداد کے تم مجھے چاہو گی یا نہیں؟ ایک بے حیثیت و غریب انسان سے شادی کرو گی؟“ وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر مضبوط لہجے میں بولا۔ فخر نے ایک بار پھر اس کی جانب دیکھا کہ شاید وہ مذاق کر رہا ہو، اس کا امتحان لے رہا ہو۔ مگر اس کی سرخ نگاہوں اور وسیعہ چہرے کے نقوش سے چائی اور سنجیدگی جھلک رہی تھی۔ وہ اسے کچھ عرصے قبل سے جانتی تھی اور اس تھوڑے عرصے میں ہی سمجھ چکی تھی کہ وہ قول کا پکا تھا، جو کہتا وہی کرتا تھا اور اب بھی وہ جو کہہ رہا تھا، وہ بھی سچ تھا۔ بھلا اس جیسے سر پھرے اور مندی شخص کا کیا مجرورہ کہ کب کیا ضد ذہن پر سوار ہو جائے اور اس کی جستجو میں ٹھوہو جائے۔

”مجھے جلد جواب دو۔ وقت نہیں ہے میرے پاس۔“ وہ بے قراری سے بولا۔ اس وقت بھی وہ بڑی کشمکش کا شکار تھا۔ فخر کا جواب ہی اس کی محبت کی کسوٹی پر پرکھا جاتا تھا۔ ”میرے خیال میں تم اچھا نہیں کر رہے۔ ہمیں اس طرح شادی نہیں کرنی چاہیے۔“

”کیوں؟“ اس مرتبہ اس کے لہجے میں سرد مہری و بیزاری عود کر آئی تھی۔ ”کسی غریب کی اولاد، دولت و جائیداد پا کر خوشحال و بڑے سکون زندگی تو گزار سکتے ہیں مگر ایک ایسا شخص جس نے آنکھ کھولتے ہی دنیا کی ہر اس شے کو اپنی دھڑ میں پایا ہو جو عام تو درکنار خاص لوگ بھی جن کی گردنیں پاتے بھلا ایک ایسا شخص کس طرح غربت و لاچاری کی زندگی گزار سکتا ہے۔ ناممکن ڈیر۔“

”ممکن ہے فخر۔ سچی محبت کی خاطر تو لوگ صراڑوں، جنگوں، ویرانوں میں مسکن بنا لیتے ہیں۔ اگر تمہیں میرے سہارے کی ضرورت ہے تو میری محبت کی خاطر قربانی دینی پڑے گی۔“

”قربانی؟ محبت؟ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تم کیا بات کر رہے ہو؟“ وہ تیز ہوا سے

اڑتے بالوں کو ہاتھ سے سمیٹتے ہوئے پریشان انداز میں بولی۔

”میں بہت سیدھی اور صاف بات کہہ رہا ہوں۔ اگر تمہیں مجھ سے کچی محبت ہے، تم میری زندگی میں شامل ہونا چاہتی ہو تو تمہیں یہ پُر آسائش زندگی چھوڑنی ہوگی۔“

”تمہیں کیا ہو گیا ہے شانی؟ دولت کے بغیر زندگی کس طرح گزاری جاسکتی ہے؟“

”اس کا مطلب ہے تمہیں مجھ سے نہیں میرے بینک بیلنس، میرے اسٹیش سے محبت ہے؟“

”میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ بغیر محبت کے زندگی گزاری جاسکتی ہے مگر بغیر دولت کے نہیں۔ اور جس ہائی کلاس میں ہم مود کرتے ہیں وہاں تو۔۔۔۔۔“

”اسٹاپ اٹ۔ مجھے اب کوئی فضول بکواس نہیں سنی۔ چلو میں تمہیں تمہارے گھر ڈراپ کر دوں۔ اور ہاں، یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ ہمارے درمیان اب کوئی رشتہ نہیں ہے میں کوئی وضاحت، کوئی دلیل نہیں سنتوں گا۔ میرا اسٹیڈیل سٹی سوچ رکھنے والی لڑکی ہرگز نہیں ہے۔ جو محبت کرتے ہیں وہ صرف محبوب سے تعلق رکھتے ہیں۔ محبوب کا ساتھ ہی ان کا زلہ راہ بن جاتا ہے، جو محبت نہیں کرتے وہ زندہ نہیں ہوتے۔“

اپنی صفائی میں کچھ کچی فتنہ کو وہ خاموش رہنے کا اشارہ کر کے بہت جذب کے عالم میں کہہ رہا تھا۔ فضلہ کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ آتے ہوئے وہ جس آرزو خوش اور پُر جوش تھی،

واپسی کا سفر میں بہت ہی خاموش و سنگم دکھائی دے رہی تھی۔

بہت خوش نصیبی تھی اس جیسے خوب رو، اسارٹ اور ہر دلعزیز بندے کو پانا۔ مگر بغیر دولت و جائیداد کے وہ ایسا ہی تھا جیسے گولڈن رنگ ڈائمنڈ سے خالی ہو۔ اور وہ تو اپنی فیملی کی

حسب خواہش ڈیڈ کے ڈاؤن ہوتے بزنس کو سہارا دینے کی خاطر اس کی جانب پریشی تھی۔ یہ حقیقت تھی کہ وہ شانز دل و جان سے مر مٹی تھی مگر اتنی شدید محبت میں مبتلا نہ

ہوئی تھی کہ خالی خولی شانز دل کا ساتھ قبول کر کے سمیری کی زندگی گزارتی۔

”وہ انسان ہی بہت تکلیف و نقصان میں ہے جو اپنی ہوس زہر اور حرص طبیعت کے

باعث نقصان و نقصان کے سودے کرتا ہے۔ تا سمجھ بھول جاتا ہے کہ اس کی رشتی صرف مخصوص حد تک ہی وراثت کی جاتی ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ وہ خدا میں بیٹھا ہے۔ ہر شے کا مالک، ہر سمت پر اختیار رکھنے والا۔

ہر ذی روح پر قادر۔

یہ خوبیاں صرف ایک ذات کی شان ہیں۔

جو واحد لا شریک ہے، زمین و آسمان کا مالک ہے، تمام مخلوق کا مالک ہے۔ اللہ اپنے بندے کا ضبط اس کا ظرف، اس کا حوصلہ اس کا ایمان آزمانے کے لئے کچھ

عرصے چھوٹ دے دیتا ہے اور بندہ سمجھتا ہے اس کی کبھی پکڑ نہیں ہوگی۔ اس کی رشتی کبھی سمجھی نہیں جائے گی۔ کبھی وہ اپنے رب کے سامنے اپنے اعمال لے کر حاضر نہیں ہوگا۔ کبھی اندھیری قبر کی آغوش میں نہیں سائے گا۔

آہ..... ایسے شیطانی دھوکے میں بہت سے دین و ایمان سے بے گانہ ہو کر آخرت کے سفر پر روانہ ہو جاتے ہیں اور ساتھ کیا ہوتا ہے؟ ساری زندگی غفلت میں گزاری، عمر کے گناہ و جھوٹ، فریب، ایہوں سے کی گئی حق تلفیوں کے انبار۔“

”چھوڑیں انابی! چلا گیا وہ..... اب تو اس کو اچھے نام سے یاد کیجئے۔“ حضرت نے بالوں کو سمیٹ کر جوڑا بتاتے ہوئے اندر دگی سے کہا۔

”ہاں۔ اللہ اس کی مغفرت کرے۔ جتنے دکھ اور تکلیفیں اس نے ہمیں دیں، وہ ہم نے معاف کر دیں۔ اللہ بھی اسے معاف کرے۔“ وہ طویل سانس لے کر گویا ہو گئیں۔

رائع قیاض اس دن حضرت کو گھر لے جانے کا کہہ کر گیا تو راستے میں سڑک پر ٹرک کی زد میں آ کر ہلاک ہو گیا تھا۔ ان تک یہ خبر اخبار کے ذریعے پہنچی تھی، جس میں اس کی

تصویر بھی تھی۔ کچھ لمحے تو اسے اپنے افساب مجید ہوتے محسوس ہوئے، تقدیر کی کیسی ستم ظریفی تھی یہ..... جب وہ اس سے بچھکارا پانا چاہتی تھی تو کامیابی نہ ہوئی تھی اور اب

جب وہ اسے دل و جان سے قبول کرنے کو تیار تھی تو وہ ہمیشہ کے لئے اسے چھوڑ کر اس دنیا سے ہی چلا گیا تھا۔

یو یا خود کا شاپرٹا ہے۔ کیا تم نے وہ سب نہیں چاہا تھا جو میں کہہ رہا ہوں؟“
 ”میں جب اندھیرے کا مسافر تھا، شہری! بے تحاشا دولت اور بے جا اختیارات کا
 نشہ جب حد سے سوا ہو چکا تھا، دنیا مجھے اپنی مٹھی میں بندھ سوس ہوتی تھی۔“
 ”اب کیا ہوا؟ دولت، اختیارات، وجاہت، خوبروی تمہارے پاس ہی موجود ہیں۔“
 ”کیوں اتنے بیزار اور بدگمان رہنے لگے ہو؟“

”اب میں روشنی میں آ گیا ہوں۔ ضمیر کی عدالت میں کڑی سزا پارہا ہوں اور میری
 مٹھی میں ندامت، پچھتاوے اور فحالت بند ہے۔ مجھے بے سکونی کی سزا دی گئی ہے اور
 مجھ سے پوچھو کہ اس سے بڑی سزا کوئی نہیں ہے۔ سکون سے بڑی راحت کوئی نہیں
 ہے۔ میری دولت، میرے اختیارات، میری وجاہت، میری خوبروی کوئی میرے کام
 نہیں آئی۔ یہ سب دے کر بھی میں سکون حاصل نہیں کر سکوں گا۔“ اُس نے بے کل لہجے
 میں کہا تو آگے بڑھ کر شہر یا دے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”تمہیں انگل کا خیال کیوں نہیں آتا؟ ان کی سالوں کی پرورش، محبت اور پیار پر یہ
 چند روزہ محبت اتنی حاوی ہو گئی کہ تم ان کی محبت اور ان کی پریشانی کو بالکل فراموش کر
 بیٹھے۔ وہ باپ ہیں مگر ایک قابل فخر اور قابل تحسین باپ جو بچپن سے آج تک صرف
 تمہاری محبت میں شریک رہے۔ دیکھو شانزل! باپ سب اپنی اولادوں کو چاہتے ہیں اور
 پیار کرتے ہیں مگر ایسے وقت میں جب سب کچھ اختیارات رکھتے تھے، تمہیں معلوم ہے نا
 تمہاری ممانعتیاری پیدائش والے دن ہی فوت ہو گئی تھیں اس وقت بھی انگل کے پاس
 دولت و جائیداد کی کوئی کمی نہیں تھی۔ اگر وہ چاہتے تو آسانی سے دوسری شادی کر سکتے
 تھے۔ تمہاری دوسری ماں لا سکتے تھے مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ صرف تمہیں سوتیلی ماں
 سے بچانے کی خاطر انہوں نے شادی نہیں کی۔ حالانکہ کئی لوگوں نے اپنی بیٹیاں اس
 شرط پر دینے کی کوششیں کیں کہ وہ تمہیں سگی ماں سے بڑھ کر پیار دیں گی، تمہاری پرورش
 کریں گی مگر انگل کسی طور یہ بات ماننے کو تیار نہ تھے کہ کوئی بھی لڑکی ان کے بیٹے کی
 دوسری ماں بن کر آئے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تم پر مٹنی اثر ڈالے۔ تمہاری

محبت میں انہوں نے اپنی خواہشات و امیگوں اور نوجوانی کے تقاضوں کو تہیاری ممانعت
 ساتھ ہی دفن کر دیا اور تم پر ان کی دنیا ختم ہو گئی۔ ذرا سوچو، دیکھو اپنے اطراف میں۔
 کون ایسا باپ ہے جو صرف ایک بیٹے کی خاطر اپنی خوشیوں اور جذبات کا گھٹا گھونٹ دیتا
 ہے جبکہ وہ صاحب حیثیت بھی ہو اور جوان اور سمارٹ بھی۔ ہمارے معاشرے میں تو
 نڈل کلاس کے لوگ جو پانچ چھ بچوں کے باپ ہوتے ہیں، کئی بیٹے کر کے چھ ماہ میں
 ہی مگر بیا لیتے ہیں۔ حالانکہ وہ اپنی جوانی و ازدواجی زندگی کی کئی بہاریں گزرا چکے
 ہوتے ہیں، مگر میری جان! ہر باپ کی محبت نفس پر غالب نہیں آ سکتی۔ بے چارے انگل
 نے ایک ہی سال تو ازدواجی زندگی کا گزرا دیا تھا۔ بچپن سے بڑی مشقت، محنت اور لگن و
 جانفشانی سے ایک ننھے سے پودے کی آبیاری کی تھی۔ اسے دقت کے سرورہ گرم و آندھی،
 طوفان سے بچا کر رکھا تھا۔ اس درخت کے پھل دینے کا وقت آیا، اس کی ٹھنڈی اور ٹھنکی
 چھاؤں میں کچھ سستانے کا وقت آیا تو وہ سب محنت و مشقت فراموش کئے زمین بوس
 ہونے کو تیار تھا۔ بہاروں کی آمد سے قبل ہی خزاؤں کا شکار بن بیٹھا تھا۔ خود کو سنبھالو
 شانزل، خود کو سنبھالو۔ تم اپنی چند روزہ محبت کے سوگ میں باپ کی برسوں کی محبت کو بھلا
 بیٹھے ہو۔ کس قدر خود غرض و خود پرست ہو تم۔“

”یہ کس نے کہا کہ میں ڈیلری سے محبت نہیں کرتا؟“ وہ سیدھا ہو کر چونک کر بولا۔

”تمہاری ان حرکتوں نے، اس گوشہ نشینی اور دنیا سے بیزاری نے۔ جب تم خطرئی کو
 پکارتے ہو، اس کے بنا مارجانے اور اس کی محبت کے بغیر زندہ نہ رہنے کی جب تم قسمیں
 کھاتے ہو تو شاید تم سوچ بھی نہیں سکتے جوان، اکلوتے، لاڈلے بیٹے کی یہ حالت دیکھ کر
 وہ کتنے اپ سیٹ ہوتے ہیں۔ تمہاری فکر، تمہاری وجہ سے ان کا برفس ہی نہیں بلکہ دل و
 دماغ دونوں بری طرح متاثر ہو رہے ہیں۔ آخر تم کب خود فراموشی سے باہر نکلو گے؟“
 شہریار جو کل شاہ زیب کے منہ سے یہ سب باتیں سن چکا تھا، اس نے پہلی بار بہت
 پروقار و با اثر جب شخصیت رکھنے والے شاہ زیب کو جب بیٹے کی محبت میں روتے دیکھا تو
 بری طرح تڑپ اٹھا تھا۔ انہوں نے خصوصی طور پر اسے پاکستان بلوایا تھا کہ وہ شانزل کا

واحد دوست تھا۔ ان کی بے غرض اور سچی محبت پر اسے بہت رشک آیا، جب وہ بولے۔
 ”بیٹا شہریار! اگر وہ لڑکی شانی کی زندگی میں چکی ہے تو اس کی خوشی کی خاطر میں سب
 کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ اگر وہ لڑکی اپنے خاوند سے طلاق لے کر شانی کے نکاح میں آتا
 چاہے تو بخوشی اُسے بہو ماننے کو تیار ہوں، بشرطیکہ وہ لڑکی اپنی رضا و رغبت سے طلاق
 لے کر شانی کے نکاح میں آئے۔ زبردست ہرگز نہیں ہونی چاہئے۔ کیونکہ زبردستی کے
 بندھن کبھی پائیدار نہیں ہوتے۔“

یہ رضامندی ان کی اس محبت کا ثبوت تھی جو وہ اس سے کرتے تھے۔ ورنہ عموماً اعلیٰ
 کینجیگوئی سے تعلق رکھنے والے افراد کی سوچ اور طرز عمل بالکل متضاد ہوتا ہے۔ جیسی اس
 نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ شانزل کو رادو راست پر لائے گا۔

”کیا میں ڈیڈی کو بہت تنگ کرنے لگا ہوں؟ میری وجہ سے پریشان ہیں؟“ وہ گویا
 خود سے مخاطب تھا۔

”شکر کرو میری جان، وہ تمہارے ڈیڈی ہیں جو تمہیں کچھ کہنے کی بجائے اس کی فکر
 میں لگ گئے ہیں کہ کسی طرح پیارے، لاڈلے، دلدارے بیٹے کی خواہش پوری ہو
 جائے۔ اگر تمہاری جگہ میں ہوتا اور انکل کی جگہ والد صاحب تو یقین رکھو اب تک مجھے وہ
 قبر میں اتار کر قصہ پاک کر چکے ہوتے کہ کنجش نے لڑکی پسند بھی کی تو وہ جو پہلے سے
 شوہر کو پیاری ہو چکی ہے۔“ شہریار اپنے والد کے لہجے کی نقل اتار کر بولا۔

”تم بار بار خضریٰ کا ذکر اس انداز میں کر کے اُس کی توہین کر رہے ہو، جو میں کسی
 طور برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ ایسی لڑکی نہیں ہے جس انداز میں تم اس کا ذکر کر رہے ہو۔
 وہ بہت شریف و باحیا لڑکی ہے۔ اگر اب تم نے اس کا نام لیا تو میں کوئی لحاظ و مروت
 نہیں کروں گا۔“ اُس نے غصے سے کہا اور ہاتھ روم میں جا کر زور سے دروازہ بند کیا۔
 شہریار نے بے ساختہ کانوں میں انگلیاں دے ڈالیں۔

موسم صبح سے ابر آلود تھا۔ جب وہ اپنی ساتھی منچر کے ساتھ اسکول آف ہونے کے

بعد گیٹ سے باہر نکلی تو ہلکی ہلکی پھوار مگر نی شروع ہو چکی تھی۔

”واصف! شاہنگ کل کر لیں گے اگر موسم درست رہا تو۔“ اُس نے اپنے گرد چادر
 درست کرتے ہوئے کہا۔ واصف نے ایک نگاہ اوپر آسمان پر ڈالی پھر ہنس کر بولی۔

”گھبراؤ نہیں مائی ڈیڑا! ہم کراچی والے اتنے خوش نصیب نہیں ہیں کہ ہجر پور بارش
 کا مزہ لوٹ سکیں۔ یہاں تو بس یہ ہلکی پھلکی پھوار اور بوند باندی آتش شوق بڑھا کر پتلی
 جاتی ہے۔ ہمارے نصیبوں کے بادل تو دوسرے شہروں میں موسلا دھار برستے ہیں۔“

”پھر بھی احتیاط لازم ہے۔ کیا معلوم آج یہ ہماری حسرتیں دھو ڈالے۔“

”جب ہوگی جب دیکھی جانے کی۔ نی الحال شاہنگ کو چلنا ہے تو بس چلنا ہے۔ مجھ
 سے انتظار نہیں ہوتا۔ اور پرسوں میرے منگیتر کی برتھ ڈے ہے۔ کم از کم ایک دن پہلے تو
 اس کے لئے گفٹ خریدنا اس کا حق بنتا ہے نا؟ چلو، میں ناں نہیں سنوں گی۔“ قریب
 سے گزرتی سیلو کیب کو روکتے ہوئے وہ اُس کا ہاتھ پکڑ کر اس کی طرف بڑھ گئی۔

واصف حیدر سے اس کی دوستی اسکول جوائن کرنے کے چند دنوں بعد ہو چکی تھی۔ وہ
 بہت شوخ و چٹیل اور پیار کرنے والی لڑکی تھی۔ اس کا تعلق اعلیٰ فیملی سے تھا۔ وہ شوق
 جاب کر رہی تھی۔ اسے گھومنے پھرنے کا کریز تھا اور اکثر کوشش کرتی تھی کہ خضریٰ بھی
 اس کا ساتھ دے۔ مگر خضریٰ بہت کم اس کا ساتھ دیتی تھی۔ کل وہ خود گھر جا کر انابی سے
 اجازت لے آئی تھی۔ انابی کی تو دلی خواہش تھی کہ خضریٰ خوش رہے۔ لوگوں سے ملے،
 گھومے پھرے، زندگی کی ریجنیوں کو محسوس کرے۔ انہوں نے بخوشی اجازت دی اور
 ساتھ ہی خضریٰ سے چسپ کر کہہ دیا کہ وہ اسے اپنے ساتھ رکھا کرے اور جہاں چاہے
 لے جایا کرے۔ انہیں اس پر اعتماد تھا۔

واصف نے پورا شاہنگ سینٹر کھنگالنے کے بعد پرنٹرز، ٹرٹ اور دو شاعری کی بکس
 خریدی تھیں۔ گفٹ پیک کروا کر باہر آئیں تو اچھی خاصی موٹی موٹی بوندیں پڑ رہی
 تھیں۔

”واہ، بیوٹی فُل! کیا آفت موسم ہو رہا ہے۔“ اُس نے گھبراہٹ میں لیتے ہوئے

مہم کر کہا۔

”تھیں موسم کی خوبصورتی بھاری ہے ایڈیٹ! مجھے فکر ہو رہی ہے اگر بارش خیر ہو مٹی تو کس طرح گھر جائیں گے؟ اس موسم میں رکشہ ٹیکسی والوں کے مزاج ویسے بھی آسان پر ہنسی جاتے ہیں۔“ خضریٰ پریشانی سے بولی تھی۔

”تیر کر بھیجی جائیں گے، فکر نہ کرو۔“ اس نے فہم کر کہا۔

”تم سے بات کرنا ہی فضول ہے۔“

”پہلے ”بیزاٹھ“ سے بیڑا اور کافی پر ہاتھ صاف کریں گے۔ اگر ٹیکسی نہ بھی ملی تو بے فکر رہو، موٹا ہل ہے میرے پاس، گھر سے گاڑی منگوا لوں گی۔“ اسے پریشان دیکھ کر کہا۔

”میں کوئی کافی دانی نہیں ہوں گی۔ کافی دیر ہو گئی ہے۔ اتنا بی انتظار کر رہی ہوں گی اور شام کو بچے بھی آجائیں گے ٹیوشن پڑھنے۔“

”انا بی کو معلوم ہے کہ تم میرے ساتھ ہو اور تمہارے بچوں کے آنے سے قبل میں تمہیں ڈراپ کر دوں گی۔“ حسب عادت وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بیزاٹھ کی جانب بڑھ گئی۔

بات تو کچھ بھی نہیں تھی لیکن اس کا ایک دم

ہاتھ کو ہونٹوں پر رکھ کے روکنا اچھا لگا

چائے میں چینی ملانا اس گھڑی بھایا بہت

زیر لب وہ مسکراتا شکر یہ اچھا لگا

اچھی آواز اور شوخ لہجے پر اس نے نگاہیں اٹھا کر دیکھا۔ قریب ہی بلیک پینٹ اور زردٹی شرٹ میں خانہ اسارت نوجوان کھڑا بڑی مسکراتی نگاہوں سے کافی میں چینی ملائی واصلہ کو دیکھ کر وہ شعر پڑھ رہا تھا۔

”اوہ، شہری تم کیوں بچھا کر رہے ہو میرا؟“ وہ مصنوعی خشکی سے بولی۔

”کیا کروں؟ کسی اور کا بچھا کرنا ہوں تو تمہیں ہی اعتراض ہوتا ہے۔“ وہ بے تکلفی

سے کرسی تھپٹ کر بیٹھ گیا اور اس کے آگے سے کافی کا گگ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔

”کر کے دکھاؤ کسی اور کو قاتل۔ اپنی اور تمہاری جان ایک نہ کروں تو۔“

”اللہ رحم فرمائے میرے مستقبل پر۔ کس قدر بظلم ٹائپ وائف ملی ہے۔“

”وائف! دماغ درست ہے تمہارا۔ کیا بول رہے ہو؟“ وہ اتنی زور سے چیخی کہ اس پاس بیٹھے لوگ ادھر دیکھنے لگے۔

”سوری۔ میرا مطلب ہے فیوچر میں تو تم مری وائف ہو ہی نا۔“

”چلیں.....؟“ دیر ہو رہی ہے۔“ خضریٰ ان دونوں کو الجھا دیکھ کر گویا ہوئی۔

”اوہ شٹ، دیکھو یہ بندہ ایسا ہی ہے۔ اس کی سوچو کی میں ہر شے فراموش ہو جاتی ہے بلکہ اس کی بک بک میں، میں تعارف کروانا ہی بھول گئی۔ یہ شہریار ہیں، میرے منگیتر۔“

”پلیز، اب تو میرا کچھ ادب کر لیا کرو۔ کس قدر بدتمیزی سے بول رہی ہو۔ آخر کار تمہارا ہونے والا سرتاج ہوں، عزت کیا کرو میری۔“ وہ جمل کر بولا۔

”ہونے والے ہو..... ہوئے تو نہیں۔ جب ہو گے تو عزت بھی ہو جائے گی۔“

”آہ! بڑے بے آبرو تیرے کوچے میں آکر رہم ہوئے۔“ خضریٰ سانس بھر کر اس نے شعر ترتیب دیا۔ واضحہ کھلکھلا کر فہم پڑی۔ وہ ان دونوں کے درمیان ہوتی بنی بیٹھی تھی۔

”خضریٰ! انا سے ملو، یہ میری بیسٹ فرینڈ ہے۔ خضریٰ..... خضریٰ حیات۔“

شہریار کو ایسا لگا جیسے اس کے دماغ میں دھماکا سا ہوا ہے۔ وہ آج کل اسی نام کے بھنڈور میں تو الجھا ہوا تھا۔ اس نے بے ساختہ نگاہیں اٹھا کر خضریٰ کی جانب دیکھا تھا۔

گلابی مائل سفید رنگت، ستواں ناک اور سحر انگیز چہرے کے نقوش، ڈارک براؤن چمکتی ہوئی آنکھوں پر گرقتی، انہنی، گھٹیری پکوں کی بھالریں، متعصب سرپا اور سیاہ چادر میں لپٹا ہوا چہرہ بہت پُر وقار و قدس لگ رہا تھا۔

”کیا یہ وہی لڑکی ہے جس نے شانزل جیسے سر پھرے کی زندگی بدل کر رکھ دی ہے؟

کیا ضروری ہے یہ وہی لڑکی ہو؟ کیا اس نام کی واحد لڑکی اس پورے شہر میں ہے؟ لیکن

”پلیز واصف! چلو، بچے ٹیوشن پڑھنے آگئے ہوں گے۔ بلا وجہ ہمیشہ ہو گئی تو اس طرح بچوں کے ذہن بھی خراب ہوں گے اور میری ریپوٹیشن بھی۔“ اس کا سوال قصداً انظر انداز کر کے وہ کھڑی ہو گئی۔ واصف کو بھی اس کی تقلید کرنی پڑی۔

انہیں ڈراپ کرنے کی ذمہ داری اس نے لے لی اور خضریٰ کے انکار کے باوجود اسے گھر ڈراپ کر کے گیا۔ اس میں اس کے دو مقاصد تھے۔ اول اس کا گھر دیکھنا اور دوم جلد ہی وہاں تنہا آکر شانزل کی کیفیت بیان کرنا اور ساتھ ہی یہ درخواست کرنا کہ وہ کسی طور شانزل کو سمجھائے کہ وہ اسے بھلا کر اپنی نئی زندگی شروع کرے۔

”کیسی لگی تمہیں میری دوست؟“ واصف نے مسکرا کر پوچھا۔

”ناگس۔ بہت کم گو اور سنجیدہ ہے۔ تمہاری دوستی کیسے ہو گئی؟“

”تمہیں معلوم ہے نا بچے اور بڑے خلوص لوگ میری کمزوری ہیں۔ وہ بھی ایسی ہی ہے۔ میری ہم عمر مگر بے چاری کے ساتھ بہت بڑی ٹریجڈی ہو گئی ہے۔“ واصف کے لہجے میں افسردگی اور دکھ تھا۔

”کیسی ٹریجڈی؟ کیا ہوا ہے؟“

”چھ ماہ قبل ایک ایکسڈنٹ میں اس کا ہسپتال ہلاک ہو گیا ہے۔“

”وہاٹ.....؟“ لہجے بھر کو اسٹیزنگ اس کے ہاتھ سے بیکا تو کار بری طرح لہرائی۔

”گرنلی۔ جب میں نے سنا تھا مجھے بھی اس قدر ہی افسوس ہوا تھا۔“

”میرا تو فرط مسرت سے ہاتھ کانپ اٹھا تھا مگر نہ!“ اس نے دل میں سوچا۔

”پہلے تو میں اسے بچلے ہی سمجھتی تھی، جب اس نے بتایا تو مجھے یقین ہی نہیں آیا کہ وہ

بیوہ ہے اور کانی دنوں تک مجھے افسوس رہا۔ مگر ایک دن انا ہی نے اس کی ساری اسٹوری

سنائی تو میرے دل نے کہا کہ ایسے دھوکے باز اور لالچی شخص کا ایکی انجام ہونا چاہئے

تھا۔“

”کیا بتایا تمہیں اس کی انا ہی نے؟“

واصف انا ہی کی قربانی سے تمام حالات اُسے بتانے لگی۔

میری چھٹی حس بتا رہی ہے کہ یہ وہی لڑکی ہے۔ اس کی سنجیدگی و محنت، سادہ و نہر وقار انعام، دلربا و معصوم حسن، دلکش و دلچسپ سراپا۔“

”میں کچھ پوچھ رہی ہوں۔ جواب کیوں نہیں دے رہے؟“ واصف کی آواز نے اسے چونکایا۔

”نگ۔ کیا؟ کیا پوچھ رہی ہو؟“ وہ اس کی جانب متوجہ ہوا۔

”تم یہاں کیوں آئے؟ آئی میں تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں ہوں؟“

”اب تم اس خوش فہمی میں مبتلا نہ ہو جانا کہ تمہاری زلفوں کی مہکارس نے مجھے یہاں کا راستہ بتایا یا میرے دل نے تمہیں پکارا۔ بلکہ میں تو یہاں کافی پینے کے لئے آیا تھا۔ جب تم پر نظر پڑی تو ادھر چلا آیا۔“ وہ شرارت سے ہنس کر بولا تو واصف کا منہ بن گیا۔

”کیسی ہیں آپ مس خضریٰ! نہ معلوم کیوں مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے۔“ وہ براہ راست خضریٰ سے مخاطب ہوا اور ہاتھ بنا کر بولا۔

”جی ہاں۔ یہ ان کی بہت پرانی بیماری ہے بلکہ لا علاج بیماری ہے کہ ہر حسین چہرے کو دیکھ کر انہیں ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔“ واصف نے فوراً بد لیا تھا۔

”اچھا۔“ اس نے آہستگی سے مختصر جواب دیا۔

”پھر تو آپ کو جگہ بھی یاد ہوگی جہاں آپ نے انہیں دیکھا تھا۔“ واصف کو بھی اسے چڑانے میں سرور محسوس ہو رہا تھا۔ جبکہ ناؤنگلی میں وہ اس کی ابجھن سلجھا رہی تھی۔

”ہوں، شاید۔ میں نے خضریٰ کی کچھ عرصے قبل شانزل گروپ آف انڈسٹریز کی ایک برانچ میں دیکھا تھا۔“ اس نے گہری کھوجتی نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا اور اس نام پر اس کے پڑ سکون چہرے پر پھلتے رنگ دیکھ کر اسے اپنے گمان پر یقین ہونے لگا۔

”جی ہاں۔ میں وہاں جاہ کرتی تھی مگر اپنے کام سے کام رکھتی تھی، اس لئے شاید آپ کو نہ دیکھ پائی۔“ اس کے لہجے میں اضطراب اور گھبراہٹ تھی۔

”اوسے وہ تو بہت ہیٹ جاہ تھی۔ کیوں چھوڑ دی آپ نے؟“

ہوں کہ اس گھر کو ایک مخلص و باوقار بادی اور بچی کی ضرورت ہے۔ یہ فرائض صرف ایک تہذیب یافتہ ملل نکلا سکتی ہے۔ ہماری نکلاں کی لڑکیاں گھر اور گھر داری سنبھالنے اور رشتے ناتوں کو سنبھالنے کی اہلیت نہیں رکھتیں۔

”آپ نے مانتے نہیں کیا ہوگا انکل! میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا تھا کہ وہ لڑکی خضرئی شانزل کے بارے میں اچھی رائے اور اچھے خیالات نہیں رکھتی۔ پہلے میں واصفہ کے ذریعے ان کی بزرگ گارجین انا بی سے گفتگو کر کے انہیں راضی کروں گا، اس کے بعد آپ کو لے کر چلوں گا۔ بلکہ ہم پریوول لے کر جائیں گے۔“ اس نے پرعزم لہجے میں کہا پھر بچہ نکلا کر بولا۔ ”انکل! ابھی یہ ساری کارروائیاں شانزل سے سیکرٹ رکھی جائیں گی۔ جب سب معاملات طے ہو جائیں گے تو بالکل عین موقع پر ہم اسے سر پرانہ دیں گے۔“

”ارے میاں! یہ تو وہی بات ہوئی کہ کنوئیں سے بچے تو کھائی آگے آگئی۔ جس شخص کو میری بیٹی چند ماہ برداشت نہ کر سکی اس شخص کے ساتھ ساری زندگی کس طرح گزار سکتی ہے؟ اور پھر آدمی بھی بدکردار اور بد چلن۔ نہ بابا، معاف کرو۔ کم از کم اس چیونٹیوں بھرے کباب سے میری بیٹی کو دور رکھو تو بہتر ہے۔ لو بھلا، ایک خدا اب سے چھٹی تھی کہ پھر۔“

”معزز خاتون! خدا اور میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔ شانزل خان اب بالکل بدل گیا ہے اور اسے بدلنے میں خضرئی کی خوش نصیبی شامل رہی ہے۔“ شہریار ان کی بات قطع کر کے عاجزی سے گویا ہوا۔ واصفہ نے ساری بات سن کر مشورہ دیا تھا کہ وہ انا بی کو راضی کر لے تو خضرئی کو راضی وہ خود کر لیں گی۔ سو آج وہ اس وقت ان کے روبرو تھا اور دلائل کے ذریعے انہیں قائل کرنے کی سعی میں مصروف تھا۔

”میری دعا ہے اللہ اسے اور ہدایت نصیب کرے، اسے اچھا اور نیک مسلمان بنائے۔ بس اس سے زیادہ ہم اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔“ وہ پانگ سے اٹھتے ہوئے نروٹھے

”سچ، وہ لڑکی بہت مظلوم اور شریف ہے۔“ شاہ زیب صاحب اُس کی زبانی خضرئی کے مخلص جان کر سخت افسردہ ہوئے تھے۔ واصفہ کی زبانی اس کے حالات سن کر وہ اسے ڈراپ کر کے نکلا نہیں تھا سیدھا ان کے آفس چلا آیا تھا۔

شانزل سے پہلے اس نے انکل سے بات کرنا مناسب سمجھی تھی جس کا انہوں نے مگر مجوشی سے مثبت جواب دیا تھا۔

”کبھی سنا تھا بہترین دوست اللہ کی بڑی رحمت ہے۔ آج تم نے یہ بات سچ کر دکھائی۔ تمہاری بے غرض اور پُر خلوص دوستی اور محبت نے اپنے دوست کو جینے کی راہ دکھائی ہے۔ پراؤڈ آف مائی سن!“ انہوں نے آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگا لیا۔

شہریار نے اس کٹھن وقت میں ان کا دل و جان سے ساتھ دے کر ثابت کر دیا تھا کہ اس کی دوستی بے مثال و قابلِ فخر و ستائش ہے۔

ادھر اس نے ان کے آنسو پونچھے تھے تو ادھر شانزل کو کرے سے کھینچ لایا تھا۔ چاہے وقتی طور پر یا محض دکھاوے کے لئے ہی سہی، وہ گوشہ نشینی سے باہر نکل کر بزنس میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ اس کے ساتھ بھی کافی وقت گزارنے لگا تھا۔

”آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔ جو کچھ میں کر رہا ہوں، آپ کی اور شانزل کی محبت کے آگے وہ کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ بتائیں وہاں کب چلیں گے؟“ وہ ان سے علیحدہ ہو کر بولا۔

”جب آپ مناسب سمجھیں۔ اگر ابھی کہیں تو ابھی چلتے ہیں۔“

”انکل! کیا آپ صدقِ دل سے خضرئی کو بہو بنا کر لائیں گے یا محض بیٹے کی نگاہوں میں اپنی پریشانی بڑھانے کے لئے اسے وقتی طور پر لے آئیں گے تاکہ عام باحیثیت لوگوں کی طرح بعد میں اس غریب لڑکی کو منتر سے آؤت کر کے اپنی حیثیت کی بہو لے کر آئیں؟“

”اللہ گواہ ہے، میرے دل میں ایسی کوئی گھٹاؤنی سازش نہیں ہے۔ بلکہ میں اب سچا

پرن سے بولیں۔“

”ٹھیک ہے، میں آپ کا مزید وقت نہیں لوں گا۔ صرف میری چند باتیں سن لیجئے۔
خضرئی کے سر پر باپ اور بیٹائی کا تحفظ نہ تھا تو اس کی زندگی کتنی کشمکشوں سے گزری،
شانزل بھی بچپن سے ماں اور بہن جیسے رشتوں کے مقدس آئینے سے محروم رہا تو کردار
میں جھول آ گیا جس میں زیادہ تعلق اس کے ماحول اور تنہائی کا تھا۔

خاندان نہ ہو تو عورت ماں اور باپ دونوں کا فرض نبھا دیتی ہے مگر مرد یہ ذمہ داریاں
بھرپور طریقے سے نہیں نبھا سکتا۔ وہ صرف باپ کا ہی رول پلے کر سکتا ہے۔ شانزل نے
برائی اور گناہ کی راہیں چھوڑ کر نیکی اور اچھائی کی راہ پر چلنے کا عزم کیا ہے اور آپ کو معلوم
ہو گا کہ بندے برائی کی جانب جلد راغب ہو جاتے ہیں یہ نسبت نیکی و اچھائی کی راہ پر
چلنے کے۔ اگر کوئی شخص وہم و گمراہی کی رہنمائی اور ساتھ میں جائے تو
ڈگمگاتے قدم مضبوط ہو جاتے ہیں۔ کسی بھولے بھٹکے کو نیک راہ پر چلانا کتنے ثواب و نیکی
کا کام ہے، یہ آپ بہتر جانتی ہیں۔ ابھی تو میں جا رہا ہوں لیکن گل آپ کا جواب سننے
ضرور آؤں گا۔ آپ فیصلہ کر لیجئے گا کہ کسی کو پُر غلوں، سبارادے کر اپنی آخرت سنوارنے
کا نیک کام کریں گی یا اسے دوبارہ گناہوں کی دلدل میں فرق ہونے کے لئے بے
احتیائی برتنے گی۔“

وہ رکائیں اور انہیں گولہ کی کیفیت میں چھوڑ کر چلا گیا۔

نیکی اور ثواب کے نام پر ان کے اندر پلٹل سی جگمگاتی تھی اور یہ کشمکش ان کے اندر
پھیلنے لگی تھی اور یہ کیفیت خضرئی سے بخلی نہ رہ سکی۔

”کیا بات ہے انا بی؟ جب سے اسکول سے آئی ہوں آپ کو پریشان دیکھ رہی
ہوں۔“ وہ ان کے قریب بیٹھ کر استفسار کرنے لگی۔

”رشتہ آیا ہے تمہارا۔“ انہوں نے چھپاتا فضول سمجھا کہ وہ کل بھی آنے کو کہہ گیا تھا
اور کب تک وہ اس سے اس موضوع پر بات نہ کرتیں۔

”رشتہ؟ کہاں سے؟“ وہ بے ساختہ ہنس کر گویا ہوئی۔

”تمہارے پاس شانزل خان سے۔“ وہ اُس کی جانب بخورد بکھتی ہوئی بولیں۔

”واہ!..... کون آیا تھا؟“ اُس کے جسم میں گویا چکریاں چٹ گئی تھیں۔

”اُس کا دوست۔ شہر یار نام بتایا تھا اس نے۔“

”اُس ذلیل کیسے شخص کی یہ بہت..... آپ نے بے عزت کر کے نکالا ہوتا اُسے۔“

”وہ کہہ رہا تھا، وہ تمہارا پاس بالکل مدھر گیا ہے۔ شریعت نہ زندگی گزار رہا ہے۔“

”مجھے کچھ نہیں سننا اس شخص کے بارے میں۔ اب کوئی آنے تو دھکے دے کر نکالے

گا یہاں سے۔“ انہوں نے کہا سمجھتا ہے خود کو۔“ غصے سے اس کا ہر حال تھا۔

بھڑبھڑ

”میں چلوں گا تمہارے ساتھ بیٹے! اور انہیں راضی کر کے ہی آؤں گا۔“ شہر یار سے

تمام صورت سن کر وہ پریشان لہجہ میں بولے۔

”بڑے صاحب..... بڑے صاحب! دیکھئے بھونے صاحب آنکھیں نہیں کھول

رہے اور بخار بہت تیز ہے۔“ اسی دم عارفین اندر سے دوڑا ہوا آیا اور بدحواسی سے بولا تو

شاہ زریب صاحب اور شہر یار دونوں ہی آگے پیچھے اُس کے بندروم کی طرف بڑھے تھے

جہاں بیڈ پر وہ بے سادہ پڑا تھا۔

”شان!..... شان!“ شاہ زریب صاحب بے قراری سے اس پر جھکے پکڑ رہے تھے۔

اس کی بیوقوفی محض ایک بہانہ ثابت ہوئی۔ وہ ستر سے پر اٹھائی نہیں۔ اُس کی سرخ

و سپید رنگت چند محنتوں میں ہی زرد ہو گئی۔ چہرے کی شادابی و تازگی کم ہو گئی۔ شاہ زریب

صاحب ہر وقت اس کے سر ہاتے موجود رہتے۔ انہیں اپنی اور بزنس کی بھی پروا نہیں

تھی۔ وہ ہسپتال میں ایڈمٹ تھا۔ اُس کا مکمل چیک اپ ہوا۔ کئی ٹیسٹ ہوئے۔ آخر کار

اُس کی ماضی کی کثرت شراب نوشی و سنگریٹ نوشی نے اثر دکھایا تھا۔ ڈاکٹرز کے بورڈ نے

یہ جان لیوا خبر سنا دی کہ وہ پچیس برس کے عارضے میں مبتلا ہو چکا ہے۔ یہ خبر ان پر بجلی

بن کر گری تھی اور وہ اندر سے بالکل ہی ڈھسے گئے تھے۔

”جوصلے سے کام لیں انکل! آپ تو بہت بہت اور جوصلے والے ہیں۔“

اس کی جینٹلا ہٹ پر شانزدل نے قہقہہ لگایا تھا گرد کی تیز لہر میں قہقہہ دب کر رہ گیا۔

”بہن تم! اللہ کے بعد میرے بیٹے کی زندگی آپ کی بیٹی کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ کے واسطے میرے بیٹے کی زندگی بچالیں۔ اس پر رحم کھائیں۔ میں خضریٰ بیٹی کے نام اپنی تمام دولت دجائیداد لکھ کر دینے کو تیار ہوں۔ صرف وہ مجھے میری اصل دولت لوٹا دے۔ اس کی ایک ہاں میرے بیٹے کو واپس پٹنے پر مجبور کر دے گی۔ وہ ایک نہیں، دو زندگیاں بچالے گی۔ میں تاحیات اس کا مشکور رہوں گا۔ تمام عمر اسے شہزادی بنا کر رکھوں گا۔ اس پر اس کی حکمرانی ہوگی۔“

وہ دولت مند سینہ جس کی حیثیت و امارت کا ایک جہاں میں ڈنکا بجاتا تھا، آج تیسری مرتبہ اس معمولی، جگہ جگہ سے ادھر سے دھڑے فرش والے گھر میں اپنی تمام حیثیت و مرتبہ بھلائے بیٹھا اپنے بیٹے کی زندگی کی بیک ماگ رہا تھا جس کے سروٹ کو ارد گرد بھی اس جگہ سے بہترین و قیمتی تھے مگر اپنے بیٹے میں لگی آگ کے آگے اسے یہ بے حیثیت گھر دنیا کی واحد جائے پناہ محسوس ہو رہا تھا۔ وہ کسی بے کس و مجبور کی طرح اس کی منت و سماجت کر رہے تھے اور آج پوری شدت سے انا بی کو ان کا درد، تکلیف اور ذکر محسوس ہو رہا تھا۔

”بھائی صاحب! شرمندہ نہ کیجئے۔ اللہ آپ کے بیٹے کو ہزاروں سال زندہ رکھے۔ ہم تو بہت ہی بے حیثیت اور غریب لوگ ہیں۔ محل میں ٹاٹ کا بیوند کبھی نہیں جتنا۔ یہ دنیا ایک کھیت کی مانند ہے۔ یہاں جو انسان یوتا ہے، وہی کل کا ٹٹا ہے۔ آپ کے بیٹے کی حالت، اس کی بیماری، اس کی لاپرواہی اور بھرمانہ غفلت کا شاخسانہ ہے۔ لڑکا ہویا لڑکی، جب وہ سن بلوغت کو پہنچ جائیں تو قدم قدم پر ان کی نگرانی اور رہنمائی کرنی چاہئے۔ مگر آپ جیسے دولت والے ان باتوں کو فرسودگی اور جہالت گردانتے ہیں اور وقت آنے پر اسی طرح سر پر ہاتھ رکھ کر دیتے ہیں۔“

”مجھے اعتراف ہے یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔ لیکن اگر گھر میں کوئی بیٹن یا ماں ہوتی تو وہ ہرگز نہ بگڑتا۔ گھر کی تنہائیوں سے گھبرا کر اس نے کلب جانا شروع کیا اور میں یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا کہ وہ اب باشعور اور سمجھدار ہو گیا ہے اور میں برس میں گمن ہو گیا۔ پھر جان بوجہ کر میں سب کچھ نظر انداز کرتا رہا کہ یہ سب تو جوانی کے شغل ہیں، خود ہی وقت آنے پر چھوٹ جائیں گے۔ مگر ایسا ہو جائے گا، مجھے معلوم نہ تھا۔“

”روپیہ ہر برائی کی جڑ ہے۔ اور پھر ان لوگوں کا تو کوئی دین ایمان ہی نہیں رہتا جو غیر ملکوں میں دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹنے کے جنون میں مذہب کے حقوق، شریعت کے فرائض سب بھول کر مسلمان ہو کر بھی غیر مسلموں کے طور طریقے اپنا لیتے ہیں۔ آج آپ اس دولت کو ایک غیر لڑکی کے نام کر دینے کو تیار ہیں جس دولت کو پانے کے لئے آپ نے اپنے مذہب سے خود کو کبھی دور رکھا اور بیٹے کو بھی محروم رکھا اور آج آپ پھر بھی خالی ہاتھ ہیں۔ سونے کے گل، ہیروں کی چمک، کچھ بھی آپ کے کام نہیں آ رہی۔ دنیا میں آپ اسے تنہی دست ہیں تو آخرت میں کیا ہوگا؟“

”میں شرمندہ ہوں، پشیمان ہوں اپنے رب سے۔ میں نے توبہ کر لی ہے اور ساتھ ہی اس کی رتی کو منہو ملی سے پکڑنے کا عہد بھی کر چکا ہوں۔ کیا میرے جاں یہ لب بیٹے کی خطائیں خضریٰ بیٹی معاف نہیں کر سکتی؟“ وہ یاسیت بھرے لہجے میں بولے۔

”میں کوشش کروں گی بھائی صاحب کہ کسی طور وہ مان جائے۔“ انا بی دھیسے لہجے میں بولیں تو وہ اٹھ کر شکستہ قدموں سے گھر کی دہلیز پار کر گئے۔

”اب جو ہوتا تھا، وہ ہو چکا بیٹی۔ جب کوئی خطا کار اپنی غلطی مان لے، سچے دل سے توبہ کر لے تو اللہ بھی معاف کر دیتا ہے۔ ہم تو خود خطا کار اور گناہگار بندے ہیں پھر بھلا ہماری کیا اوقات کہ ہم کسی کو معاف نہ کر سکیں۔ سب بھلا دو میری بیٹی۔ ہاتھ تمام لو اس بچے کا جو خود اپنے ہاتھوں موت کی دہلیز پر پاؤں رکھ چکا ہے۔“ انا بی نے شاہ زیب صاحب کے جانے کے بعد اندر کمرے میں بیٹھی سب سنی ہوئی خضریٰ کو جا کر سمجھاتے ہوئے کہا۔

”ہرگز نہیں اٹا لی۔ پہلے میں نے آپ کے اور امی کے سامنے سر جھکا دیا تھا مگر اب میں ایسا کوئی فیصلہ نہیں سنوں گی۔ اس شخص کا ساتھ تو مجھے بالکل گوارا نہیں ہے۔“ وہ قطعیت سے بولی۔

”اللہ کے قہر و غضب سے ڈر۔ مت کسی مجبور و پریشان کا امتحان لے۔ وہ کروڑ پتی آدمی صبح شام ہماری ویلنڈر پر آتا ہے کسی بھکاری کی طرح فریاد کرتا ہوا۔ کتنا سخت وقت اس پر آیا ہے۔ مجھے خوف آتا ہے تمہاری یہ ہٹ دھرمی ہمیں کسی مصیبت میں مبتلا نہ کر دے۔ مان جائی! حیرا ساتھ اسے خوشیوں کی طرف، زندگی کی طرف لوٹا دے تو کیسا ثواب کا کام ہوگا۔ اور پھر خود سوچو۔ تم اس طرح کب تک تنہا زندگی گزارو گی؟ میرا ساتھ تو بہت ناقول اور بودا ہے۔ عمر گزار چکی ہوں۔ کبھی بھی سانس کی ڈوری کٹ سکتی ہے۔“

”کسی کی خاطر آپ خود کو مت کوئیں اٹا لی۔“

”میں سچ بیان کر رہی ہوں! زندگی بڑی دغا باز ہوتی ہے۔ کب دغا دے جائے کسی کو معلوم نہیں۔ کوئی بھی انسان ماں کے پیٹ سے چورہ ڈاگودہ آوارہ، بدکردار پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ حالات اسے اپنے سانچے میں ڈھالتے ہیں۔ شانزل کو بگاڑنے میں بھی یہی حالات تھے۔ اور سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اس کے سر پر ماں کا سایہ نہ تھا اس لئے وہ اس قدر بگڑ گیا۔ مگر دیکھو جب اس نے اصل جیا اور عورت کا وقار دیکھا تو اس نے توبہ کر لی۔ اسیر ہو گیا تمہارا۔ پابند کر لیا خود کو تمہارے لئے۔“

”یہ سب اپنی جگہ درست ہے۔ مگر میرا دل نہیں مانتا۔“

”اوندہ۔۔۔ مانتی رہو اپنے دل کی۔ جب قت گزر جائے گا تو سمجھتا دے رہ جائیں گے۔ اور یہ بات گرہ میں باندھ لو، تنہا عورت معاشرے میں سہولت سے زندہ نہیں رہ سکتی۔ اور لی، تم یہ دیکھو، بے شک ازدواجی زندگی کا ایک لمحہ بھی تم نے نہیں گزارا۔ مگر لوگ جانتے ہیں کہ تم یہ وہ ہو۔ اگر بھولے جھٹکے کسی نے اپنانے کی خواہش ظاہر بھی کی تو وہ کوئی رنڈا ہوگا یا دوسری شادی کا کوئی شوقین یا پھر کوئی نشے باز۔ کسی اچھے گھرانے سے رشتہ آنے کا تو تصور بھی نہیں ہے۔“ اس کے مسلسل انکار نے انہیں مشتعل کر ڈالا تھا۔

خضریٰ نے کچھ کہا نہیں۔ گردن جھکائے بیٹھی رہی۔ انہیں خود ہی اس پر پیارا آگیا تو کچھ توقف کے بعد اس کے قریب بیٹھ کر گویا ہوئیں۔

”تم نے خود ہی تو مجھے سب کچھ بتایا۔ حتیٰ کہ گاؤں جانے والی بات بھی کچھ غرصہ چھپانے کے بعد بتادی۔ ہمارا رشتہ ہی ایسا ہے کہ ہم اگر ایک دوسرے سے کوئی بات چھپانا چاہیں تب بھی نہیں چھپا سکتے۔ خود سوچو اگر وہ فطرتاً عیاش ہوتا تو اسے تو بار بار ایسے مواقع ملے ہتھے کہ وہ اپنی من مانی کر سکتا تھا۔ مگر تم نے خود بتایا کہ سوائے ذمہ داری باتوں کے اس نے کوئی نازیبا حرکت نہیں کی بلکہ بہت عزت و احترام سے پیش آتا رہا۔ تو بات صاف ہوئی کہ وہ ایسا نہیں ہے جیسا تم سمجھتی رہی ہو۔ دیکھو بیٹی! معاف کر دو اسے اور اس کا ہاتھ تھام کر اپنی ماں کی تربیت کی لاج رکھ لو۔ مجھے یقین ہے اس بار اللہ تم پر اپنی رحمت کی برسات ضرور کرے گا۔“ انہوں نے التجائیہ لہجے میں کہا تو ان کے شانے پر سر رکھتے ہوئے کئی آنسو ایک ساتھ چھٹک پڑے تھے۔

دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن

بیٹھے رہیں تصورِ جاں کے ہوئے

”تمہاری آواز سے اچھی تو یہ کڑوی دوا لیاں ہی ٹھیک ہیں۔“

”وہ کیا کہتے ہیں، مگر کا مرنا دال برابر۔ تو میری مثال کچھ یونہی ہے۔“

”اگرے نہیں بھی، میرے بیٹے کی آواز تو بہت پیاری ہے۔“ شاہ زیب صاحب

اعتر آتے ہوئے خوش دلی سے بولے تو شہریار نے اکر کر شانزل کی جانب دیکھا تھا۔

”طبیعت کیسی ہے مائی سن؟“ وہ شانزل کے قریب بیٹھ کر پوچھنے لگے۔

”بالکل ٹھیک ٹھاک۔ آپ بہت کمزور ہو رہے ہیں۔“ اس نے ڈکھی نگاہوں سے

ان کی جانب دیکھا۔ وہ جو باپ کے بجائے اس کے بڑے بھائی لگا کرتے تھے، ان دو

ڈھائی ماہ میں ایک دم ہی نڈھال اور بوڑھے نظر آنے لگے تھے۔ اس کا دل تڑپ اٹھا۔

”اپنا خیال رکھا کریں ڈیڈی! یہ کیا حالت بنالی ہے آپ نے اپنی؟“

”سوچا تھا جتنا جوان ہو جائے گا تو باپ کا خیال رکھے گا۔ مگر بچے کو تو لہنا بھی خیال نہیں۔“

”ڈیڈی۔ ڈیڈی! آپ رو رہے ہیں؟“ اُن کے آنسو اس سے برداشت نہیں ہوئے۔

”نہیں ہے مجھ میں طاقت جوان بننے کو تکلیف سے بڑے دیکھنے کی۔ تم امریکہ جانے کی حامی کیوں نہیں بھرتے؟ کیوں مجھے کند چھری سے ذبح کر رہے ہو؟“

”مان جاؤ انگل کی بات۔ کیوں مزادے رہے ہو اپنے ساتھ ان کو بھی۔“ شہریار نے جھپکے لیچے میں کہا۔

”ٹھیک ہے۔ میں تیار ہوں۔“ وہ طویل سانس لے کر گویا ہوا۔

”ساتھ ایک شرط اور بھی ہے۔“

”جی فرمائیے؟“

”تمہیں شادی کر کے بیوی کو ساتھ لے کر جانا ہوگا۔“

”ڈیڈی!..... آپ مذاق کر رہے ہیں؟“

”نہیں۔ یہ تمہاری بہتری کے لئے ہے۔ شام کو تمہارا نکاح ہے اور کل فلائٹ سے تم

اپنی بیوی کے ساتھ امریکہ علاج کے لئے روانہ ہو جاؤ گے۔“

”کیسی باتیں کر رہے ہیں ڈیڈی آپ؟ میں مر رہے کسی کی زندگی خراب نہیں

کرنا چاہتا۔“

”ایک بار لڑکی سے قول لہو، پھر کچھ کہنا۔“ اور اس کے بولنے سے قبل وہ دونوں

کمرے سے نکل گئے اور وہ غصے سے ہونٹ جھینچے آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔

اُس نے بے حد جھپکتے ہوئے کمرے میں قدم رکھا تھا۔ وہ سامنے بیڈ پر سفید براق

بستر پر نہ جانے سو رہا تھا یا جاگ رہا تھا۔ آنکھیں بند تھیں اور اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ

گئیں۔ زرد چہرے، بکھرے بالوں اور بے حد کمزور جسم والا یہ وہ شانزل تو نہیں تھا جس

کی سرخ و سپید رنگت، بھرپور وجاہت اور اسمارٹنس کی لڑکیاں دیوانی تھیں۔

ان تین ماہ کے عرصے میں تو وہ بے حد بدل گیا تھا۔ وہ بے دھیانی میں آگے بڑھی تو کرسی سے ٹکرائی۔ آہٹ پر شانزل نے آنکھیں کھولیں تو جاسے میں خواب کا گمان ہوا۔

حقیقت تھی یا خواب.....؟

وہ سامنے تھی۔ ہر آہٹ پر جس ستم گر کے آنے کا گمان ہوتا تھا۔

”السلام علیکم۔ کیسے ہیں آپ؟“ اُس کی ایک نکل گھورتی نگاہوں سے گھبرا کر وہ

بول اٹھی۔

”یہ خواب نہیں، یہ وہی ہے۔ وہ جس کے تصور سے جسم کا سارا لہو، دل کی ساری

دھڑکنیں، جذلوں کی ساری جدتیں، روح کی ساری لطافتیں، میری تمام سوچیں، قلب کی

ساری خواہشیں جس کے پیچھے سے منسوب تھیں۔ اس تمام عرصے میں وہ میرا خشک بن گئی

تھی جس کا تصور میری نگاہوں میں بس گیا تھا۔ اس سے میرا وہی تعلق تھا جو جسم کا روح

سے ہوتا ہے۔

”کیسے ہیں آپ؟“ اُس کی وارفتہ نگاہوں اور محویت نے اُسے پزل کر ڈالا تھا۔

”تم بن احوال بالکل بے روح وجود کی مانند۔ میں نے تمہیں چاہئے کا گناہ کیا

ہے۔ مگر یقین کرو محبت اختیار ہی جذبہ ہوتی تو میں خود کو روک لیتا لیکن میں بالکل بے بس

و مجبور ہو گیا۔ تمہیں دیکھا، سب سے الگ، بالکل انوکھی شخصیت لگی تمہاری۔ جلد ہی میں

محسوس کرنے لگا تم وہی ہو جس کی مجھ کو تلاش تھی، جس کی میرے دل کو ضرورت تھی۔ وہ

ہاتھ، وہ حرکتیں میں جان بوجھ کر کرتا تھا تاکہ تم مجھ سے بدظن ہو کر دور چلی جاؤ۔“

شدت تکلیف سے وہ لمبے بھر میں پسینے پسینے ہو گیا۔

”یہ کیا ہو رہا ہے آپ کو؟ میں ڈاکٹر کو بلائی ہوں۔“ اُس کی بگڑتی حالت دیکھ کر وہ

گھبرا کر بولی مگر اس نے منع کر ڈالا۔

”نہیں۔ پہلے میری بات سنو۔ تم نے میری ساری گستاخوں کو بچے دل سے معاف

کر دیا نا؟“

”ہاں..... اور میں آپ کے ساتھ زیست کا سفر طے کرنے کو تیار ہوں۔“

”محبت خود غرض نہیں ہوتی خضرئی! اب کچھ باقی نہیں بچا۔ میں تمہاری زندگی خراب کرنا نہیں چاہتا۔ تمہیں پانا میری خواہش تھی جو حسرت بن گئی۔“

”نہیں شانزل، آپ کو میری خاطر پلٹنا ہے۔ میں نے زندگی میں کوئی خوشی نہیں پائی۔ مگر اب میں خوشیوں سے دستبردار نہیں ہوں گی اور آپ کو بھی میرا ساتھ دینا ہوگا۔“ وہ اس کے ہاتھ کو آنکھوں سے لگا کر رو دی تو اس کی سچی محبت اور چاہت پا کر شانزل کو اپنے مردہ وجود میں نئی حیات کی توانائیاں از سر نو بیدار ہوتی محسوس ہوئیں اور بیماری کو قوت مدافعت و ہمت سے زیر کرنے کی انگلیں توانا ہو گئی تھیں۔

”ارے..... ارے بھابھی جان! اب دلہنیں ہنستی مسکراتی وداع ہوتی ہیں۔“ اسی دم شہریار اندر آ کر بولا تو سٹپٹا کر اس نے شانزل کا ہاتھ چھوڑا تھا۔

”انکل! مت کیجئے گا اس کی شادی۔ انکار کر رہا ہے۔“

”نہیں..... نہیں۔ ڈیڈی کی بات میں نے کبھی نہیں ٹالی۔ اب بھی ماننے کو تیار ہوں۔“ وہ شوخی سے بولا تو شہریار ہنس پڑا تھا۔ خضرئی ڈاکٹر کو بلانے کمرے سے نکل گئی اور بیٹے کی آنکھوں میں خضرئی کا عکس دیکھ کر اب وہ مطمئن تھے کہ ان کا بیٹا کچھ تکلیف دہ مراحل سے گزر کر صحت مند زندگی کی طرف لوٹ آئے گا۔ بخوبی واقف تھے کہ شانزل اپنی پسندیدہ شے حاصل کر کے ہی سکون حاصل کرتا ہے۔

(ختم شد)